ہر مسلمان مرد وعورت کے لئے ایک بہترین رسالہ

اِہتمامِ مشورہ

افاضات

مسیح الامۃ حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب شروانی رحمۃ اللہ

از اکابر خلفاء

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

خصوصاً

★ مہتمم و پرنسپل صاحبان کے لئے
★ مدرسین کے لئے
★ معلمین کے لئے
★ اساتذہ کرام کے لئے
★ انتظامیہ کے لئے
★ ائمہ کرام کے لئے
★ کمیٹی والوں کے لئے

مشورہ کے فوائد

★ مشورہ کے احکامات
★ اہلِ شورٰی کی صفات
★ امیر و ذمہ دار کی صفات
★ اطاعتِ امیر کی حکمت

وغیرہ اِن جیسے اہم اُمور پر مشتمل ایک نایاب کتاب

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد۔ اردو بازار۔ کراچی

فون ۷۷۲۵۶۷۳

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

رسالہ

اہتمام مشورہ

افاضات

مسیح الامۃ حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب شروانیؒ

از اکابر خلفاء

حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ

ناشر

زم زم پبلشرز

شاہ زیب سینٹر، نزد مقدس مسجد، اردو بازار۔ کراچی

فون : 77 25 673

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان

عرض ناشر

چھوٹے سے گھر کا انتظام ہو یا کروڑوں کی آبادی والے ملک کا، کسی چھوٹے سے دکان کے چند ملازمین کا یا کسی بین الاقوامی کمپنی کے لاکھوں ملازمین کا، چپڑاسی ہو یا ڈائریکٹر، چوکیدار ہو یا مدرسہ کے مہتمم یا اسکول کے پرنسپل صاحب، مسجد کا خادم ہو یا مسجد کے صدر صاحب کوئی بھی شعبہ ہو کیسے ہی افراد ہوں اگر اپنے امور مشورہ سے طے کرتے ہیں اور امیر کی اطاعت میں چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپس میں سچی محبت پیدا فرمادیتے ہیں حتی کہ مینیجر اور کلرک کے دل جڑ جاتے ہیں۔

اگر گھر میں بیوی اپنے امور خانہ داری میں شوہر اور بچوں سے مشورہ کرے اور گھر کے امیر یعنی شوہر کے فیصلے کو اپنا فیصلہ سمجھے اسی کے مطابق عمل کرے۔ شوہر بیوی اور جوان بچوں سے مشورہ کرے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھتے ہوئے اور بیوی بچوں کو اپنے اعتماد میں رکھے تو وہ گھر دنیا ہی میں جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح مدرس، ٹیچر، مہتمم اور پرنسپل کی اطاعت نہ کریں، بلکہ ہر استاد اپنی رائے اور اپنے فیصلہ ہی کو حرف آخر سمجھے باوجودیکہ پرنسپل نے سب سے رائے لے کر فیصلہ کیا لیکن جس کی رائے کے خلاف فیصلہ ہوا وہ یا تو پرنسپل اور ان کے معاونین اساتذہ کی غیبت شروع کردے، یا طلباء کو ان کے خلاف بھڑکائے (وغیرہ وغیرہ) تو یہ سب اجتماعی ناقابل معافی جرم ہے، اور یہ معاملات کے اندر خیانت عظمیٰ ہے، ہاں اگر آپ کسی ادارہ میں آتے ہیں اور آپ کا مزاج ان سے نہیں مل پاتا تو سال کے اخیر میں یا معاھدہ کی شرائط کے موافق "ھٰذا فراق بینی و بینک" کے تحت آپ استعفاء نامہ پیش کرسکتے ہیں، لیکن اس ادارہ میں رہتے ہوئے آپ کو اپنے امیر کی اطاعت کرنی ضروری ہے، امیر کی اطاعت کرنے سے جو نقصان نظر آرہا ہے شاید وہ نقصان بہت کم ہو جو بنسبت اُس کے امیر کی نافرمانی کے بعد ہوگا اور فی الوقت

اس ادارہ کے سربراہ امیر، ڈائریکٹر کی اطاعت ضروری ہے جب تک کہ وہ خلاف شرع کوئی ایسا حکم نہ دیں جس میں اللہ رب العزت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی ہو۔

اسی طرح امیر کو چاہئے کہ وہ اپنے ادارہ کے تمام ساتھیوں سے یا سمجھ بوجھ رکھنے والے خاص افراد سے مشورہ ضرور کرلے، اور مشورہ میں پہلے سے اپنی رائے ایک سوچ کر نہ رکھے کہ فیصلہ تو اسی پر کرنا ہے صرف برکت کے لئے ان سے پوچھ لوں، نہیں بلکہ ہر ایک کی رائے دھیان سے سنے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرکے ایسا فیصلہ کرنے کی کوشش کرے کہ جس پر سب یا اکثریت کی رائے آجائے۔

اسی سلسلہ میں حضرت حکیم الامّت رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ خاص مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کا رسالہ "اہتمام و شوریٰ" بہت پسند آیا جی نے چاہا کہ ہمارے پاکستانی احباب بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور ہمارے ہر ادارہ میں کام کرنے والوں میں اتفاق واتحاد پیدا ہو خاص طور پر مدرس اور ٹیچر پرنسپل اور مہتمم یا انتظامیہ کی غیبت سے بچے اور انتظامیہ اور مدیر، اساتذہ کا پورا پورا احترام کرے اور ان کی رائے کو اہمیت دے۔

لہٰذا قارئین کی خدمت میں یہ رسالہ پیش ہے، ہم میں سے ہر ایک اپنی اصلاح کی نیت کرتے ہوئے اس رسالہ کو پڑھے اور تمام مدارس دینیہ و مکاتب قرآنیہ اور مسلمانوں کے اجتماعی و انفرادی مراکز کے لئے دل سے دعا مانگے، چونکہ مولانا کا قیام زیادہ تر ہندوستان ہی میں رہا چنانچہ بہت سے لوگوں کو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا تعارف نہ ہوسکا ہو لہٰذا "نقوش رفتگاں" (از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ) اور "شخصیات و تاثرات" (مؤلفہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحت دامت برکاتہم) میں جو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا مختصر تذکرہ آیا ہے وہ اس رسالہ کے ساتھ بطور تعارف شامل کردیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے۔ آمین۔

والسلام
ناشر

تاثرات

(حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدّظلّہم)

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء کی تاریخ دین اور علم دین سے تعلّق رکھنے والوں کے لئے جس جانکاہ حادثے کی خبر لے کر آئی وہ حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ کی وفات حسرت آیات کا حادثہ تھا۔ حضرت قدس سرہ کی ذات اس وقت ایک ایسا چشمہ فیض تھی جس سے نہ صرف برصغیر، بلکہ افریقہ، یورپ اور امریکہ کے دور دراز علاقوں کے مسلمان مستفید ہورہے تھے، جس نے اس انحطاط پذیر زمانے میں اتباع سُنّت پر مبنی دین کی خالص اور بے غل و غش فہم کو عملی صورت میں مجسم کر کے دکھایا، اور جس نے شریعت و طریقت کا حسین امتزاج اپنے قول و فعل اور تعلیم و تربیت کے ذریعے عام کر کے حضرت حکیم الامّت قدس سرہ کے فیوض کو زندہ تابندہ رکھا۔ آج یہ مقدس وجود ہم سے جدا ہوگیا، اور ہم اس دریائے فیض سے محروم ہوگئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے گذشتہ صدی میں تجدید و احیائے دین کے سلسلے میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، ان کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ اپنی تعلیم و تربیت اور ارشاد و اصلاح کے ذریعے اپنے ایسے خلفاء کی ایک بڑی جماعت تیار کی جو اپنے شیخ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اور جن کا مزاج و مذاق حضرت حکیم الامّت قدس سرہ کی تعلیمات کا جیتا جاگتا نمونہ تھا، ان خلفاء نے حضرت حکیم الامّت قدس سرہ کی وفات کے بعد بھی اصلاح و ارشاد کا

یہ سلسلہ جاری رکھا، اور چار دانگ عالم میں اپنے فیوض پھیلائے، لیکن رفتہ رفتہ یہ نفوس قدسیہ بھی راہی آخرت ہوئے۔ پاکستان میں اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ تھے، اور ان کی وفات کے بعد صرف ہندوستان میں حضرت حکیم الامتؒ کے دو خلفاء باقی رہ گئے تھے، ایک حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ اور دوسرے مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہم العالی۔ اب حضرت مولاناؒ بھی ہم سے رخصت ہوگئے اور اب حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں سے صرف حضرت مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہم باقی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ رحمت ہم پر تادیر بعافیت سلامت رکھیں۔ آمین ثم آمین۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ حضرت حکیم الامتؒ کے ان خلفاء میں سے تھے جنہوں نے سالہا سال اپنے شیخ کی صحبت اٹھائی، اور ان کے رنگ کو اپنی زندگی میں اس طرح جذب کیا کہ ان کا وجود اپنے شیخ کی زندہ یادگار بن گیا۔

آپ ۱۳۲۹ھ میں ضلع علی گڑھ کی ایک بستی سرائے برلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد جناب احمد حسین خان صاحب شیروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور اپنے علاقے میں بڑے بااثر اور ہردلعزیز سمجھے جاتے تھے۔ حضرت کو بچپن ہی سے عبادات و طاعات کا خاص ذوق تھا، بچپن ہی میں نوافل، تہجد اور ذکر کے عادی ہوگئے تھے، آپ کے ایک رشتہ دار مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت تھے، آپ اکثر ان کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے، اور انہی کے ذریعے آپ کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے مواعظ مطالعے کے لئے میسر آئے جس کے نتیجے میں آپ کو حضرت حکیم الامتؒ سے غائبانہ طور پر ہی خصوصی محبت و عقیدت پیدا ہوگئی۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی کے ایک سرکاری اسکول میں درجہ ششم تک حاصل کی، اور اس کے ساتھ بہشتی زیور اور حضرت حکیم الامت کے مواعظ کا مطالعہ جاری رکھا۔ اسکول میں آپ ہمیشہ ممتاز نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے، لیکن

طبیعت چونکہ ابتداء ہی سے دینی تعلیم کی طرف راغب تھی، اس لئے کچھ عرصے کے بعد والد صاحب نے آپ کا طبعی رجحان دیکھتے ہوئے آپ کو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کرادی۔ ابتدا سے مشکوٰۃ شریف تک کی تعلیم آپ نے اپنے وطن ہی میں حاصل کی آپ کے اس وقت کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی بطور خاص قابل ذکر ہیں جن سے حضرتؒ نے مشکوٰۃ سمیت درس نظام کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ لیکن یہ عجوبہ بھی استاد اور شاگرد دونوں کے انتہائی اخلاص اور دونوں کے مقام بلند کا کرشمہ ہے کہ بعد میں جب شاگرد کو حضرت حکیم الامتؒ سے بیعت و ارشاد کی اجازت حاصل ہوئی تو استاد نے اپنی اصلاح کے لئے شاگرد سے رجوع کیا، اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ نے اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اللہ اکبر! ایک طرف حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ کے مقام کا اندازہ لگائیے کہ ان کے استاذ نے بیعت ارشاد کے لئے ان کا انتخاب کیا، اور دوسری طرف حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ کے اخلاص اور بے نفسی کا عالم دیکھئے کہ اپنے شاگرد کو اپنا شیخ طریقت بنانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہوا۔ باوجود یہ کہ وہ خود حضرت تھانویؒ کی طرف سے مجاز صحبت قرار دیئے جاچکے تھے۔ سچ ہے کہ جب دل میں فکر آخرت بیدار ہوتی ہے، اور انسان کو اپنی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوتی ہے تو رسوم و قیود کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی فکر انسان کے سینے میں بنے ہوئے خود پسندی کے تمام بتوں کو پاش پاش کر ڈالتی ہے، پھر اندر سے اللہ کی بندگی میں ڈوبا ہوا وہ انسان ابھرتا ہے جس کی پاکیزگی اور تقدس پر فرشتے رشک کرتے ہیں، اور جس کی لغت میں نام و نمود، ذاتی شہرت پسندی اور عجب و تکبر کے الفاظ نہیں ہوتے، پھر اس کی سیرت و کردار کی مہک ہر اس شخص کو معطر کرتی ہے جو اس سے چھو کر گذر جائے، لیکن اس بھری پُری دنیا میں عظمت کردار کے ایسے نگینے خال خال ہی وجود میں آتے ہیں۔

بہر کیف! حضرتؒ نے اپنا زمانۂ طالب علمی اس طرح گذارا کہ استاد تو ان کی ذہانت و ذکاوت اور متانت کردار کے معترف تھے ہی، والد صاحب بھی آپ کی نیکی کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ اپنے اس بیٹے سے اپنے حقے کی چلم کبھی نہیں بھروائی، حضرتؒ نے بعض مرتبہ والد کی خدمت کے شوق میں یہ کام کرنے کی کوشش کی، لیکن والد صاحب نے سختی سے انکار کردیا۔

حضرتؒ نے مشکوٰۃ شریف تک تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد دورۂ حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، اور وہاں اپنی تعلیم کی تکمیل فرمائی، جن بزرگوں سے یہاں آپ نے استفادہ کیا، ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صاحبؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں، اور اسی زمانے میں حضرتؒ نے احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

حضرت حکیم الامت سے عقیدت و محبت تو بچپن ہی سے تھی، حضرت کی علی گڑھ تشریف آوری کے موقع پر زیارت بھی ہوچکی تھی، لیکن باقاعدہ بیعت اور اصلاحی خط و کتابت کا آغاز دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے بعد ہوا، اور چھٹیوں میں تھانہ بھون حاضری کا بھی معمول رہا۔ یہاں تک کہ جس سال آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے "یعنی ۱۳۵۱ھ" اسی کے فوراً بعد شوال ۱۳۵۱ھ میں حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو بیعت کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ یوں تو حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء کی فہرست کافی طویل ہے، لیکن حضرت نے اپنے زمانہ علالت میں خاص طور پر گیارہ خلفاء مجازین کے نام شائع فرمائے تھے جن کے بارے میں یہ تصریح فرمائی تھی کہ ان کے طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے۔ ان منتخب خلفاء میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

بلکہ یہ امتیاز بھی شاید حضرت والاؒ ہی کو حاصل ہوا کہ حضرت حکیم الامتؒ نے

اپنے متعلقین میں سے ایک صاحب کو اس شرط پر اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت دی کہ وہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ سے اپنا اصلاحی تعلّق قائم کریں، اور ہر ماہ جو خط و کتابت ہو، وہ مجھے (یعنی حضرت حکیم الامتؒ کو) دکھایا کریں۔ چنانچہ دو تین سال تک برابر وہ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں اپنے خطوط اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان قدس سرہ کے جوابات پیش کرتے رہے، لیکن حضرت الامتؒ نے آپ کے کسی جواب پر کوئی گرفت نہیں فرمائی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی اس خصوصی نظر شفقت کا اثر تھا کہ حضرت مولاناؒ کی تعلیم و تربیت کا فیض دور دور تک پھیلا۔ حضرت حکیم الامتؒ کے ارشاد پر آپ نے جلال آباد میں قیام فرمالیا تھا اور وہاں مفتاح العلوم کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی، اور تقریباً نصف صدی تک اسی مدرسے کو فیض رسانی کا مرکز بنائے رکھا۔ وہیں پر درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و ارشاد اور مدرسے کے انتظام و انصرام کی خدمات میں مشغول رہے۔ یہیں پر عرصہ دراز تک صحیح بخاری شریف کا درس دیا جس کی تقریر کا کچھ حصّہ شائع ہو چکا ہے۔

جن حضرات نے حضرت موصوفؒ کی زیارت کی ہے اور جلال آباد میں آپ کی مصروفیات کا مشاہدہ کیا ہے وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے ہوں گے کہ حضرتؒ کی زندگی سراپا کرامت ہے۔ احقر کو یہ شرف بالکل آخری دور میں حاصل ہوا جب آپ کے ضعف و علالت کا دور تھا، اور آپ قریبی مسجد تک بھی سہارے سے تشریف لے جاتے تھے، لیکن اس ضعف کے عالم میں بھی معمول یہ تھا کہ تہجد کے وقت سے جو کام میں لگتے، مغرب کے وقت تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ فجر کے بعد برائے نام ناشتہ فرماتے، اور پھر مغرب تک کچھ تناول نہیں فرماتے تھے۔ اور فجر کے بعد سے مسلسل اپنی نشست پر دوزانوں بیٹھے رہتے، احقر نے کبھی آپ کو چار زانو بیٹھے نہیں دیکھا۔ اسی انداز نشست پر بیٹھ کر اہل حاجت کی حاجتیں پوری فرماتے جس کا جی چاہتا۔ بیٹھک کی چق اٹھا کر اندر آجاتا، اور اپنی ضرورت بیان کرتا،

حضرتؒ پوری خندہ پیشانی سے اس کا کام کرتے، بیچ بیچ میں ڈاک کے جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ ساری دنیا سے متوسلین کے خطوط آتے تھے، اور ڈاک کے ذریعے ان کے باطنی مسائل کا حل تجویز فرمایا جاتا، صبح نو بجے سے مجلس عام شروع ہوتی، اور دو دو تین تین گھنٹے تک علوم و معارف کے دریا بہتے رہتے۔ اس دوران کوئی محسوس بھی نہ کرسکتا تھا کہ حضرتؒ ضعف کے اس عالم میں ہیں، بعض اوقات مجلس تین گھنٹے سے بھی زیادہ طویل ہوجاتی، مگر حضرتؒ پر تعب کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ان مجالس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف و طریقت کے وہبی علوم کا ناپیدا کنار سمندر رواں دواں رہتا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں حضرتؒ کی نشست نہیں بدلتی تھی۔ مجلس کے بعد پھر وہی کاموں کا سلسلہ شروع ہوجاتا، اور نماز کے اوقات کو چھوڑ کر مغرب تک جاری رہتا تھا۔

تواضع، سادگی اور فنائیت کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو دنیا بھر کا خدمت گذار سمجھا ہوا تھا۔ مدرسہ کے طلبہ کی بیماری کی خبر سنتے تو ان کی نہ صرف بیمار پرسی، بلکہ اپنے ہاتھوں سے ان کی خدمت کرتے، ایک نو مسلم طالبعلم کی تمام ضروریات کی کفالت آپ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی، وہ صاحب کچھ عجیب طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ جب ان کے جی میں آتا، عین مجلس میں آکر ایسی باتیں حضرت والاؒ سے کہہ دیتے جو سننے والوں کو گستاخانہ معلوم ہوتیں، دکان داروں سے قرض کرلیتے، اور پھر آکر تقاضا کرتے کہ مجھے پیسے چاہئیں۔ ایک مرتبہ مجلس میں آئے اور کہنے لگے کہ "ہمارے جوتے ٹوٹ گئے ہیں، اور بنوا دیجئے" حضرتؒ نے فرمایا کہ "ابھی تو خرید کر دیئے تھے، تھوڑے سے ٹوٹے ہوں گے، مرمت کروادی جائے گی۔" انہوں نے کہا، "ہمیں معلوم نہیں، آپ دیکھ لیجئے۔" آپ نے فرمایا "لاؤ" دیکھ لوں "اس پر انہوں نے کہا کہ "وہیں ہیں چق کے باہر، آپ دکھ لیجئے" ان کے اس جواب پر حضرت والاؒ مجلس سے اٹھ کر دھوپ میں باہر تشریف لائے، جہاں بہت سے جوتے رکھے تھے۔ چونکہ آپ کو ان کے جوتے کی پہچان نہیں تھی، اس

لئے مختلف جوتے اٹھا اٹھا کر فرماتے رہے کہ "یہ تمہارے جوتے ہیں؟" اور وہ صاحب اندر ہی اندر سے انکار کرتے رہے۔ بالآخر جب دیر گزر گئی تو حاضرین میں سے کسی صاحب نے ان سے کہا کہ "تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آگے بڑھ کر دکھلادو" اس پر انہوں نے اپنے جوتے دکھائے، اور حضرتؒ نے مرمت کے لئے پیسے دیئے۔

کسی نے ان صاحب کے بارے میں حضرتؒ سے عرض کیا کہ یہ صاحب ایسی بے تکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ "بھائی حضرت تو سب لوگ کہتے ہیں، کوئی ایسا بھی تو ہو جس سے میں اپنے آپ سنبھالتا رہوں، اور میری اصلاح ہوتی رہے۔"

ایک مرتبہ حضرتؒ مدرسہ تشریف لے جارہے تھے، راستے میں ایک بڑے میاں اپنے مکان کے دروازے کے باہر چارپائی پر لیٹے ہوئے کراہ رہے تھے۔ حضرت والاؒ نے ان سے سلام کے بعد حال دریافت کیا، انہوں نے کمر میں درد کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا "لائیے، میں آپ کی کمر دبادوں" انہوں نے سختی سے انکار کیا، آپ اس وقت تو مدرسہ تشریف لے گئے، لیکن رات کو عشاء کے بعد پھر ان کے پاس پہنچ گئے، اور ان کی کمر دبانی شروع کردی، اور ان کے انکار پر فرمایا کہ صبح تو دوسرے حضرات بھی موجود تھے آپ ان سے شرماتے ہوں گے، لیکن اس وقت کوئی نہیں ہے، اب دبوا لیجئے آپ کو آرام آجائے گا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے اصلاحی تعلّق قائم ہونے کے بعد آپ پر مخلوق خدا پر شفقت کا ایک خاص حال اس درجہ طاری ہوا کہ انسان تو انسان کسی جانور اور کیڑوں مکوڑوں کو بھی اپنی ذات سے کوئی ادنیٰ تکلیف پہنچنا بے حد شاق گذرتا تھا۔ یہاں تک کہ موذی حشرات الارض کو بھی اپنے ہاتھ سے مارنے پر قدرت نہ ہوتی تھی۔ جس شخص کا جانوروں کے ساتھ یہ معاملہ ہو، وہ انسانوں کی تکلیف کا کس درجہ خیال رکھے گا؟ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت والاؒ کا مستقل قیام اگرچہ جلال آباد میں تھا، لیکن دعوت و ارشاد کے مقصد سے آپ نے اطراف ملک اور بیرون ملک سفر بھی بہت سے کئے۔ برصغیر کے علاوہ جنوبی افریقہ، برطانیہ، فرانس، امریکہ، پاناما، مصر وغیرہ کے دورے فرمائے، اور اس طرح آپ کا علمی اور روحانی فیض ان تمام علاقوں میں پہنچا، اور دنیا کے ان تمام خطوں میں آپ کے متوسلین اور متعلقین موجود تھے جو خط و کتابت سے اصلاحی تعلّق استوار کئے ہوئے تھے، ان حضرات کے خطوط کا ایک انبار ہر وقت آپ کے سامنے موجود رہتا، اور ہر خط کا اطمینان بخش جواب مختصر مدت میں روانہ ہوجاتا۔

حضرتؒ کا تذکرہ احقر نے بچپن میں سب سے پہلے اپنے استاذ گرامی قدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم (صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان و مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی) سے سنا جو مدتوں حضرتؒ کے مدرسے میں تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دیتے رہے تھے، اور بعد میں پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ اسی زمانے میں حضرتؒ دو ایک مرتبہ کراچی تشریف لائے تو دارالعلوم میں بھی تشریف آوری ہوئی اور حضرت والد ماجد صاحب قدس سرہ سے ملاقات فرمائی۔ پہلی بار آپ کی زیارت اسی موقع پر ہوئی، ایک انتہائی سادہ اور متواضع وجود، جسمانی اعتبار سے منحنی، لیکن سرخ و سفید چہرہ مبارک پر زہد و عبادت کے انوار، کم گوئی اور فروتنی کی وجہ سے کوئی اندازہ بھی نہ لگا سکتا تھا کہ یہ مشت استخواں علوم و معارف کے کتنے دریا سینے میں جذب کئے ہوئے ہے۔

آپ بکثرت لاہور بھی تشریف لاتے تھے، اور اپنے بھانجے اور داماد جناب مولانا وکیل احمد شیروانی صاحب مدظلہم کے یہاں قیام فرماتے تھے۔ وہاں بھی متعدد مرتبہ زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ پھر جب احقر کے شیخ و مربی سیدی و سندی حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی قدس سرہ کی وفات ہوئی تو احقر پر ایک عالم حسرت طاری تھا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ جیسے شیخ کامل سے جو فائدہ اٹھانا چاہیئے تھا، میں اپنی نااہلی کی بنا پر نہیں اٹھاسکا۔ دوسری طرف حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ کے بعد

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا رہ گیا ہوں۔

اس موقع پر قلب میں شدت کے ساتھ یہ تقاضا پیدا ہوا کہ حضرتؒ کے بعد اپنی نگرانی اور اصلاح کے لئے حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ سے اصلاحی تعلّق قائم کروں، چنانچہ احقر نے آپ کی خدمت میں اس مقصد کے لئے عریضہ لکھا۔ حضرت والاؒ کا جواب ملا کہ:

> ''احقر تو خادم ہے، جو چاہے، استقامت کے ساتھ خدمت لے۔''

اس کے بعد، بفضلہ تعالیٰ خط و کتابت کے ذریعے حضرتؒ سے اصلاحی تعلّق تقریباً سات سال قائم رہا۔ اس دوران اتفاق سے حضرت والاؒ کی پاکستان (لاہور) تشریف آوری صرف ایک مرتبہ ہوئی۔ اس موقع پر بفضلہ تعالیٰ حضرتؒ کی مجالس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد دو مرتبہ احقر بھی جلال آباد حاضر ہوا اور حضرت والاؒ کے سایہ شفقت میں چند روز گذارنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حضرتؒ کی بے پایاں عنایتوں نے ہمیشہ نہال فرمایا۔ جلال آباد کے قیام کے دوران روزانہ حضرتؒ کی مجلس میں حاضری کی توفیق ہوئی، اس زمانے میں حضرتؒ تین تین گھنٹے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زائد بیان فرماتے۔ لیکن محویت کا عالم یہ ہوتا کہ یوں محسوس ہوتا جیسے یہ وقت پلک جھپکتے گذر گیا، اور جو علوم و معارف وہاں سننے میں آتے، ان کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ؎

> آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

احقر کو جسمانی حاضری اور براہ راست صحبت سے استفادہ کا موقع تو بہت کم ملا لیکن الحمدللہ، مراسلت کے ذریعے اپنے تقریباً تمام کاموں میں حضرتؒ سے رہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ خط جانے اور جواب آنے میں کم از کم بیس دن لگ جاتے تھے، لیکن جب ڈاک میں حضرتؒ کا مکتوب گرامی نظر نواز ہوتا تو ایک عجیب

سرور محسوس ہوتا، اور جواب پڑھ کر دیر تک سرور طاری رہتا۔

حضرتؒ کا ضعف تو عرصہ سے روز افزوں تھا، لیکن معمولات میں فرق نہیں آتا تھا، اب چند ماہ پہلے معلوم ہوا کہ ضعف اتنا بڑھ گیا ہے کہ مسجد تک بھی نہیں جاپاتے، اور مجلس کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ ڈاک کا جواب بھی نہیں لکھ رہے ہیں، بیچ میں کبھی کبھی افاقے کی خبریں بھی آتی رہتیں۔ احقر نے ۲ نومبر کو ہندوستان جانے کا ارادہ کیا ہوا تھا، اور جلال آباد حاضر ہونے کا قصد تھا، لیکن اچانک ازبکستان کا سفر پیش آگیا، اور ہندوستان کا سفر وہاں سے واپسی پر ملتوی کردیا گیا، لیکن حضرتؒ کی زیارت مقدر میں نہ تھی، ازبکستان سے واپسی کے چند ہی دن بعد اچانک حضرت والاؒ کے وصال کی خبر آئی، جمعرات کا دن گذرنے کے بعد جمعہ کی شب میں حضرتؒ نے بلند آواز سے ذکر شروع کیا، اور ذکر کرتے کرتے ہی دنیا سے کوچ فرماگئے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون جمعہ کے دن حضرت والاؒ کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ سنا ہے کہ حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب مدظلہم العالی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

تاثرات

(حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہم)

۱۶؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۲ھ نومبر ۱۹۹۲ء کو حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادی کا وصال ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً شاملۃً کاملۃً۔

حضرت مرحوم، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے اجلۂ خلفاء میں تھے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنے آخری دور علالت میں اپنے گیارہ خلفاء کے اسمائے گرامی اس تصریح کے ساتھ شائع فرمائے تھے کہ "ان کے طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے" ان گیارہ حضرات کی فہرست میں حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

حضرت مرحوم ۱۳۲۹ھ میں ضلع علی گڑھ کی ایک بستی سرائے برلہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے سرکاری اسکول میں درجہ ششم تک ہوئی، اسی دوران بہشتی زیور اور حضرت حکیم الامت کے مواعظ شریفہ کا مطالعہ جاری رہا، لیکن چونکہ ابتداہی سے طبیعت نیکی و پارسائی کی طرف تھی اور بچپن ہی سے طاعت و عبادت کا ذوق تھا۔ اس لئے والد ماجد نے اسکول سے اٹھاکر فارسی و عربی کی تعلیم شروع کرادی۔ ابتداء سے مشکوٰۃ شریف تک کی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ ۱۳۵۰ھ میں دورۂ حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی

محمد شفیع دیوبندیؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ بچپن ہی سے عقیدت و محبت تھی۔ آپ کے مواعظ شریفہ اور تصنیفات کا مطالعہ بھی شروع ہی سے جاری تھا جس سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اسی سال حضرت حکیم الامتؒ سے باقاعدہ اصلاحی تعلّق قائم کرلیا۔ شعبان ۱۳۵۱ھ میں حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا، اور حضرت حکیم الامتؒ کے حکم سے جلال آباد میں (جو تھانہ بھون کے قریب ہے) اقامت پذیر ہوئے اور مدرسہ مفتاح العلوم کا اجرا فرمایا جہاں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی تھی، صحیح بخاری کی تدریس حضرت خود فرماتے تھے، اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک علوم نبوت کی نشر و اشاعت اور اصلاح و ارشاد میں بتوفیق ایزدی مشغول رہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی عنایت خاصہ نے حضرت مرحوم کو چند خصائص سے نوازا تھا جو اس زمانے میں نادر الوقوع ہیں۔

اول یہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے بچپن ہی سے طاعت و عبادت اور اہل اللہ سے تعلّق کا ذوق عطا فرمایا تھا۔ بچپن اور جوانی کا زمانہ عام طور سے لاابالی کا دور ہوتا ہے مگر حضرت مرحوم ابتداء ہی سے زاہد شب زندہ دار تھے، اور حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کو حدیث نبویؐ شاب نشأفي عبادة اللّٰه کا مصداق بنایا تھا۔ (حدیث میں ہے کہ سات آدمیوں کو قیامت کے دن عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا جس دن کہ اس کے عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ انہی سات خوش بخت انسانوں میں ایسے نوجوان...... کا ذکر فرمایا جس کی نشو و نما اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی ہو)

دور طفولیت ہی سے طبیعت نیکی کی خوگر ہوگئی ہو اسی برس کے سن کو پہنچ کر اس میں نیکی کا ذوق و مزاج کس قدر پختہ ہوگیا ہوگا، اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

دوم: فنائیت و تواضع انسانیت کا سب سے بلند ترین جوہر ہے جس پر بے شمار اخلاقی کمالات متفرع ہوتے ہیں، جیسا کہ عجب و کبر، خود پسندی و خود رائی نفسانی

رذائل میں سب سے بدتر رذیلہ ہے جس کو حضرات صوفیاءؒ ''اُمّ الامراض'' سے تعبیر کرتے ہیں حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت کو فنائیت کے جوہر انسانیت سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا، گویا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

﴿انتم بنو ادم و أدم من تراب﴾ (ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۶۹۸)

''تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے۔''

پر آپ کی نظر ہمیشہ جمی رہتی تھی۔ اس لئے کبر و تعلّی کا وہاں دور دور پتہ نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنے تئیں سب سے کمتر سمجھتے ہیں، ہر شخص کے ساتھ سراپا شفقت و رافت تھے، کسی انسان کو کیا معنیٰ؟ کسی حیوان کو بھی اپنی ذات سے تکلیف پہنچ جانا گوارا نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں آپ کے متعدد واقعات معروف و مشہور ہیں۔

سوم: کسی شخص کو اپنے اکابر کا اعتماد حاصل ہونا دولت کبریٰ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری وقت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی تسلی کے لئے فرمایا:

﴿لقد صحبت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فاحسنت صحبتهٗ ثم فارقك وهو عنك راضٍ، ثم صحبت ابابكر رضى اللّٰه عنه فاحسنت صحبتهٗ ثم فارقك وهو عنك راضٍ ثم صحبت المسلمين فاحسنت صحبتهم ولئن فارقتهم لتفار قنهم وهم عنك راضون﴾

''آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، پس حسن و خوبی کے ساتھ آپؐ کی صحبت کا حق ادا کردیا، پھر آپؐ

اس حال میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ وہ آپ سے راضی تھے، پھر آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت اٹھائی پس حسن و خوبی کے ساتھ ان کی رفاقت کا حق ادا کردیا وہ آپ سے اس حال میں جدا ہوئے کہ وہ آپ سے راضی تھے، پھر آپ نے مسلمانوں کی صحبت پائی، پس حسن و خوبی کے ساتھ ان کا حق رفاقت ادا کیا۔ اب اگر آپ ان سے جدا ہوں گے تو اس حال میں جدا ہوں گے کہ وہ آپ سے راضی ہوں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿اما ماذکرت من صحبة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم و رضاه فانما ذالک من من اللّٰہ من به علی و اما ماذکرت من صحبة ابی بکر و رضاه فانما من من اللّٰہ من به علی﴾ (مشکوٰۃ صفحہ ۵۵۹)

"تم نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی رضا مندی کا ذکر کیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر انعام تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا اور جو تم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور ان کی رضامندی کا ذکر کیا ہے سو یہ بھی مجھ پر اللہ تعالیٰ کا انعام تھا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اکابر کی صحبت و رفاقت میسر آنا اور ان حضرات کا اس حال میں دنیا سے رخصت ہونا کہ وہ اس پر اعتماد کرتے ہوں اور اس سے راضی ہوں یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا انعام عظیم ہے۔

حضرت مرحوم کو حق تعالیٰ شانہٗ نے اس نعمت سے ممتاز و مفتخر فرمایا تھا۔ صرف

ایک سال کے اصلاحی تعلّق کے نتیجہ میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی طرف سے خلافت و اجازت کا ملنا آپ کے جوہرعالی کی نشاندہی کرتا ہے، اور پھر آخری ایام میں حضرت حکیم الامتؒ کا آپ کو اپنے ان گیارہ خلفاء کی فہرست میں شامل کرنا جن پر حضرت کو اعتماد تھا، یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا آپ پر انعام عظیم تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے شیخ مرشد حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ذوق و مزاج اور طریق تعلیم و تربیت کو پوری طرح جذب کرلیا تھا۔ ایک موقع پر حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا تھا کہ عیسیٰ و مسیح دونوں بڑھ گئے۔ (عیسیٰ سے مراد حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ مؤلف "انفاس عیسیٰ" اور مسیح سے مراد حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ)

آپ کے ان امتیازی اوصاف و کمالات کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو جاذبیت اور محبوبیت عطا فرمائی، ہندوپاک سے لے کر افریقہ اور مغربی ممالک تک آپ کا سلسلہ پھیلا اور بے شمار حضرات اس کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہوئے۔

سن مبارک چوراسی سال کے قریب تھا۔ طبعی اضمحلال اور مختلف عوارض کا سلسلہ ایک عرصہ سے چل رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ سے صاحب فراش چلے آرہے تھے تاآنکہ شب جمعہ ۱۶ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ کو وقت موعود آپہنچا اور ذکر الٰہی میں مشغول ہونے کی حالت میں واصل بحق ہوئے۔

﴿اللھم اغفرلہٗ و ارحمہ و عافہٖ و اعف عنہ و اکرم نزلہ ووسع مدخلہ و ابدلہ دارًا خیرًا من دارہ و اھلا خیرا من اھلہٖ اللھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہٗ﴾

حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں حضرت اقدس مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ پاکستان میں آخری خلیفہ تھے اور ہندوستان میں صرف دو اکابر تھے۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق مدظلہ العالی۔ حضرت مولانا مسیح اللہ

خان کے رخصت ہو جانے کے بعد گلشن اشرفی کا صرف ایک پھول باقی رہ گیا اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت با کرامت رکھے۔ آمین

تمہید

ضروی گذارش یہ ہے کہ ابھی پچھلے دنوں بعض مدارس میں ہنگامی حالات سے اہتمام اور مجلس شوریٰ کی حیثیت کا مسئلہ طشت ازبام ہوا، اور مختلف باتیں زبانی و تحریری، اطراف و اکناف عالم میں رواں دواں ہوئیں تو اہل علم و عقل میں خلجان واقع ہوا، اور اندرون ملک گجرات وغیرہ اور بیرون ملک مختلف مقامات، پاکستان، جنوبی افریقہ، لندن وغیرہ سے علماء و عقلاء نے بکثرت زبانی اور تحریری طور پر اس سلسلہ میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر نزاعی فضاء میں اس مسئلہ پر کچھ لکھنا سود مند نظر نہ آیا۔ اور یہی طریق اسلاف کا بھی رہا ہے کہ ایسے وقت سلامت روی یکسوئی اور خاموشی ہی کو قرار دیتے رہے۔ بالخصوص جب کہ اہل زمانہ کا یہ حال ہے کہ کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے کے لئے تیار نہیں نظر آتا، اب کسی کے علم و عقل اور تجربہ وبصیرت پر التفات و اعتماد نہیں اس لئے اپنی رائے کے خلاف بات بے جھجک رد کردی جاتی ہے خواہ وہ کسی کی بھی ہو۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے حال میں قلم اٹھانے اور کچھ لکھنے کو دل کیسے گوارا کرسکتا ہے بس یہ شعر مطابق حال ہے ؎

وہ مایوس تمنا کیوں نہ سوئے آسمان دیکھے
کہ جو منزل بمنزل اپنی کوشش رائیگاں دیکھے

ایک وہ زمانہ تھا کہ بڑوں کی عظمت و وقعت اور ان کے ساتھ وابستگی بمحبت و

اطاعت ایسی تھی کہ بڑا جو کچھ کہدیتا خواہ وہ کیسا بھی اپنی رائے کے خلاف ہوتا اسی پر عمل ہوتا تھا اور اپنی رائے یک لخت چھوڑدی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کا ممبر بننے کے لئے ایک مقامی رئیس شیخ زادے کی ممبری کی خواہش پوری نہ کی جانے پر اس درجہ شورش اور فتنہ برپا ہوگیا تھا کہ مدرسہ بند ہوجانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا اس لئے مدرسہ کے اراکین مہتمم وغیرہ سب حضرات نے حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت ایسے سنگین حالات میں اگر ان کو ممبر بنالیا جائے تو یہ شر اور فتنہ بھی دفع ہوجائے گا اور بظاہر ضرر بھی کچھ نہ ہوگا چونکہ کثرت تو پھر بھی حضرت کے خدام ہی کی رہے گی، حضرت گنگوہیؒ نے ان کی ممبری قبول کرنے سے صاف انکار کردیا اور فرمایا کہ مدرسہ مقصود نہیں رضائے الٰہی مقصود ہے، نااہل کو ممبر بنانے میں ہم سے مواخذہ ہوگا اور ممبر نہ بنانے سے شر بڑھا اور مدرسہ بند ہوگیا تو باز پرس ان سے ہوگی۔ اس جواب پر سب خاموش اور اپنی رائے سے خالی الذہن ہوگئے، اس پر عمل کرنے سے سب شر ختم ہوگیا۔ تو اس وقت ایسے سلیم الطبع تھے کہ بڑے کی تابعیت و اطاعت کے خلاف نہ کرتے تھے اب ایسی بات کہاں تو پھر کچھ کہنے اور لکھنے کے لئے دل کیسے آمادہ ہو۔

بالآخر رفتہ رفتہ جوش و خروش کی فضاء سکون پذیر ہوگئی ادھر علماء اطراف و اکناف کا اصرار برابر جاری رہا اور مہتمم و مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیات اور ہر ایک کے حدود و احکام و جزئیات کی تعیین وتوضیح کی ضرورت پیش کی جاتی رہی تو پھر یہ خیال کرتے ہوئے کہ حق جو، وحق پسند لوگوں کے لئے تو بہر حال اس مسئلہ کی وضاحت مفید ہی ہوگی جو لوگ شریعت کے موافق عمل کرنے والے ہوں گے ان کے لئے اس تحریر سے سہولت میسر آئے گی، اس لئے اس سلسلہ میں تحریر کردینا راجح ہوگیا اور توکلاً علی اللہ غور و خوض اور کتب تفسیر و حدیث کا تتبع کرتے ہوئے کام شروع کیا گیا۔

شروع مقصد

سو عرض ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے واضح حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝﴾

جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ آپ مہتم بالشان امور میں صحابہ سے مشورہ کر لیا کیجئے پھر جب آپ کسی ایک جانب کا پختہ ارادہ فرمالیں تو اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کیجئے یعنی اس کام کو کر ڈالئے، بیشک اللہ تعالیٰ اعتماد و بھروسہ کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

اس آیت شریفہ میں اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ لینے کو فرمایا گیا ہے لیکن دلالۃً ہر امیر بلکہ تمام مؤمنین کو آیت عام ہے۔ لہٰذا امت مسلمہ کے لئے یہ آیت ایک دستور العمل ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ مؤمنین کی صفات میں خود قرآن پاک ہی میں ارشاد ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۝﴾ (پارہ: ۲۵ سورۃ الشوریٰ)

"اور ان مؤمنین کا باہمی کام مشورہ سے ہوتا ہے۔"

آیات مذکورہ کی تفاسیر اور شرعی احکام اور مشورہ کے بعد نفاذ کا اختیار وغیرہ کی گفتگو سے قبل امیر و شوریٰ کے مفہوم و مصداق کو بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شوریٰ کے معنیٰ

روح المعانی میں ہے:

﴿الشوریٰ مصدر کالبشریٰ، وقال الراغب المشورة اخراج الرائ بمراجعة البعض الی البعض و الشوریٰ الامر الذی یتشاور فیه و المشهور کونه مصدرًا﴾

(روح المعانی پارہ:۲۵ صفحہ۴۶)

"شوریٰ مثل بشریٰ کے مصدر ہے۔ اور امام راغبؒ نے فرمایا ہے مشورہ رائے حصل کرنا ہے بعض کو بعض کی طرف (کلام کو) لوٹانے کے ذریعہ اور شوریٰ وہ چیز ہے جس میں مشورہ کیا جائے اور مشہور شوریٰ کا مصدر ہونا ہے۔"

مفردات امام راغب میں ہے:

﴿التشاور، والمشاورة، و المشورة استخراج الرأی و مراجعة البعض الی البعض و الشوریٰ الامر الذی یتشاور فیه﴾ (المفردات صفحہ ۲۷۲)

اس عبارت کا وہی مطلب ہے جو سابق میں بیان کیا گیا۔

تفسیر مظہری میں ہے:

﴿الشوریٰ مصدر کالفتیا بمعنی التشاور﴾

(تفسیر مظہری جلد۸ صفحہ ۳۲۸)

"شوریٰ فتیا کی طرح مصدر ہے تشاور کے معنیٰ میں ہے یعنی باہم مشورہ کرنا۔"

تفسیر مدارک میں ہے:

﴿و معنی شاورت فلانًا اظهرت ما عندی و ما عنده﴾

(تفسیر مدارک تحت الایۃ)

"یعنی شاورت فلاناً کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں نے اپنی رائے ظاہر کی اور اس نے اپنی۔"

ان عبارات عربیہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مشورہ، مشاورت، شوریٰ تینوں الفاظ مترادف اور ہم معنیٰ ہیں جن کے معنیٰ مختلف رائیں معلوم کرنا ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوگیا کہ رائے دینے والوں کا کام صرف رائے دینا ہے، رہا اس کا نافذ کرنا یا اس پر عمل کرانا یہ ان کا کام نہیں یہ ان کے دائرہ عمل سے بالکل باہر ایک الگ چیز ہے۔

اولی الامر کون لوگ ہیں

قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے اپنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ (پارہ: ۵ سورۃ النساء)

"اے ایمان والو اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔"

اس آیت شریف میں صاف طور سے اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے اس لئے اولی الامر کا مصداق جاننا بھی ضروری ہے۔

امر، ہر مہتم بالشان قول و فعل کو کہتے ہیں اور حکم کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے۔ اولی عربی زبان میں جمع کے لئے آتا ہے اس لئے اولی الامر کے معنیٰ (حکم والے) ہوئے۔ اس لفظ کے معنیٰ سے ہی ظاہر ہے کہ یہ لفظ صرف حکام و سلاطین کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس میں عموم و شمول ہے جیسا کہ ذیل کی کتب تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔

صاحب انوار التنزیل فرماتے ہیں:

﴿(اولی الامر) یرید بھم امراء المسلمین فی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و بعدہ ویندرج فیھم الخلفاء و القضاۃ و امراء السریۃ وقیل علماء الشرع﴾

(انوار التنزیل جلد۲ صفحہ ۱۴)

"اولی الامر سے عہد نبوی اور بعد کے امراء مسلمین مراد ہیں، اور اس میں خلفاء قاضیان، امراء لشکر سب داخل ہیں اور کہا گیا ہے کہ علماء شرع بھی داخل ہیں۔"

ابن کثیرؒ کا قول

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

﴿والظاھر انھا (اٰیۃ اولی الامر) عامۃ فی کل اولی الامر من الامراء والعلماء﴾ (ابن کثیر جلد ا صفحہ ۵۱۸)

"اور ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے ہر حکم والے کو یعنی امراء علماء (وغیرہ سب کو۔)"

تفسیر خازن میں ہے:

﴿قال الزجاج واولی الامر من یقوم شان المسلمین فی امر دینھم و جمیع ما اذّی الیہ صلاحھم﴾

(تفسیر خازن جلد ا صفحہ ۳۷۲)

"کہ اولی الامر وہ تمام اشخاص ہیں جو مسلمانوں کے دینی امر اور ان کی صلاح کی چیزوں کے قیم و منتظم ہوں۔"

مندرجہ بالا تفاسیر سے واضح و ظاہر ہے کہ اولی الامر سے مراد صرف حکام یا

سلاطین ہی نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم بہت عام ہے۔

حضرت شیخ الحدیث سہارنپوریؒ کی رائے

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے الابواب و التراجم میں اولی الامر کی مراد میں علامہ عینیؒ سے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد آخری قول اس کے عام ہونے کا نقل فرمایا ہے اور اسی کو صحیح فرمایا ہے امام بخاریؒ بھی اسی کی طرف مائل ہوئے ہیں، چنانچہ لکھا ہے:

﴿الحادی عشر عام فی کل من ولی امر شئ وھو الصحیح والیہ مال البخاری بقولہ ذوی الامر﴾

(الابواب والتراجم جلد۵ صفحہ ۳۴)

"گیارہواں قول یہ ہے کہ یہ لفظ ہر اس شخص کے لئے عام ہے جو کسی امر کا والی ہو اور یہی صحیح ہے اسی کی طرف امام بخاریؒ مائل ہوئے ہیں۔"

مُلّا جیونؒ کی رائے

نیز تفسیرات احمدیہ مؤلفہ مُلّا جیون رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

﴿والحق ان المرادبہ کل اولی الحکم اما مَاکان او امیرا، سلطانًا کان اوحاکماً عالما کان او مجتھداً قاضیا کان او مفتیاً علٰی حسب مراتب التابع و المتبوع لان النص مطلق فلا یقید من غیر دلیل الخصوص﴾ (تفسیر احمدیہ صفحہ ۱۶۹)

"اور حق بات یہ ہے کہ اس (اولی الامر) سے ہر صاحب حکم

مراد ہے خواہ امام ہو یا امیر، سلطان ہو یا حاکم، عالم ہو یا مجتہد، قاضی ہو یا مفتی تابع اور متبوع کے مراتب کے اعتبار سے (سب مراد ہیں) اس لئے کہ نص (قرآنی) مطلق ہے لہٰذا اس کو بلا دلیل کے مقید نہیں کیا جاسکتا۔"

نیز احادیث ذیل سے بھی اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ امیر اور اولوالامر کا مفہوم شریعت کی اصطلاح میں عام ہے۔

لفظ امیر اصطلاح شریعت میں عام ہے

﴿عن ابی سعید الخدریؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذا کان ثلٰثة فی سفر فلیئومروا احدھم﴾ (مشکوٰۃ صفحہ ۲۳۱ باب آداب السفر)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تین آدمی سفر میں ہوں تو ان میں سے ایک کو امیر بنالیں۔"

(تین آدمی اس لئے فرمایا کہ اس زمانہ میں امن نہ تھا تو آپ نے ایک یا دو آدمی کو سفر کرنے سے منع فرمادیا تھا اب اس کا وجوب تو ختم ہوگیا ہے، استحباب باقی ہے) اس حدیث شریف سے واضح ہوگیا کہ امیر سے مراد صرف سلطان یا حاکم ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت عموم ہے حتیٰ کہ سفر کے رفقاء کو بھی یہ حکم ہے کہ اپنے کسی رفیق کو امیر بنا کر اس کی اطاعت کو لازم کرلیں کیونکہ عقل سلیم کا یہی تقاضا ہے کہ مدار کار کسی شخص واحد پر ہو۔

﴿عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنھما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الا کلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیته فالا مام الذی علی الناس راعٍ وھو مسئول

عن رعیته و الرجل راعٍ علٰی اهل بیته وهو مسئول عن رعیته و المرءة راعیة فی بیت زوجها وولده وهی مسئولة عنهم و عبدالرجل راعٍ علٰی مال سیده وهو مسئول عنه الافکلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیته ﴾ (مشکوٰۃ شریف باب الامارۃ صفحہ ۳۲۰)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے متعلّق سوال ہوگا پس لوگوں پر بادشاہ نگہبان ہے اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا اور آدمی اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اولاد کی نگہبان ہے اس سے ان کے متعلّق سوال ہوگا اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال میں نگہبان ہے اس سے اس کے متعلّق سوال ہوگا سو خوب یاد رکھو کہ تم میں ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ اس حدیث شریف میں رعیت کے لفظ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنے ماتحت کا امیر ہے۔"

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات بالبداہت و الصراحت ثابت ہوگئی کہ لفظ امیر ہر اس شخص پر جس کے کچھ ماتحت ہوں تشریعی طور پر مستعمل ہوا ہے اس کی اطاعت کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ اولی الامر میں داخل ہے اس کی اطاعت واجب ہے۔

مولانا فتح محمد صاحبؒ تائب شاگرد رشید مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنویؒ کی رائے

چنانچہ مولانا فتح محمد صاحبؒ تائب شاگرد رشید مولانا عبدالحیٔ صاحبؒ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف خلاصۃ التفاسیر میں اولی الامر کے متعلق مختلف مرادوں کا ذکر فرماکر فرماتے ہیں:

"اولوالامر سے عام مراد لی جائے یعنی ہر کام میں اس کا حاکم و مختار اولی الامر ہے تو ان تمام صورتوں کو بلا تکلّف شامل ہے جیساکہ مسلم و بخاری نے روایت کیا کہ فرمایا الاکلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیتہ تم سب چرواھے (نگراں) ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے متعلّق سوال ہوگا اور فرمایا کہ امام رعیت کا راعی ہے اور زوج زوجہ کا اور مرد اپنے گھر والوں کا اور عورت اپنے شوہر کے مال و عیال میں اور غلام اپنے مولیٰ کے مال میں راعی اور ذمہ دار ہے۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہے کہ داروغہ اپنے ماتحتوں میں اور آقا اپنے نوکروں میں اور ہر شخص اپنے متعلّقین کے حق میں آمر(امیر) ہے اور یہ باز پرس جو اس کے ذمہ لازم کی گئی ہے بالضرورت چاہئے کہ وہ لوگ اس کے مطیع ہوں پس ایسی تمام صورتوں میں بقدر قوت و حیثیت اطاعت لازم ہوگی۔"

(خلاصۃ التفاسیر صفحہ ۳۹۹)

آگے فرماتے ہیں:

"سلطان اور مجتہد یا استاذ یا شیخ یا والد یا زوج وغیرہ جس امر مباح

کو لازم کردیں وہ دو حال سے خالی نہیں۔

❶ یہ کہ امر انتظامی ہوگا جیسے طریق جنگ یا تدبیر امر قواعد انتظامی اس کے لزوم میں کوئی کلام نہیں ورنہ حکومتیں باطل اور مصلحتیں معطل اور نظم برہم اور امر مختل ہوجائیں گے اور یہ لزوم اس عہد پر مبنی ہے جو حاکم و محکوم میں ہوتا ہے۔

❷ یہ کہ عبادات اور عقائد میں ہو، پس ایسا لزوم باطل ہوگا کہ دین میں نئی بات پیدا کرنے کا کسی کو حق نہیں اور بوقت اختلاف مامور کو حق رجوع حاصل ہے۔"

(خلاصۃ التفاسیر صفحہ۳۹۹)

بہرحال مندرجہ بالا آیت سے اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا وجوب اور تفاسیر و احادیث سے اس کا عموم بالصراحت ثابت ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ ہر شخص اپنے ماتحت کا امیر ہے اور ماتحت کو اس کی اطاعت واجب ہے۔

اطاعت امیر کن امور میں واجب ہے

لیکن یہ اطاعت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نہ ہوگی کیونکہ حدیث میں ہے:

﴿لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق﴾

(مشکوٰۃ شریف صفحہ۳۲۱)

"کسی مخلوق کی خالق کی معصیت میں اطاعت نہیں۔"

ایک عام مغالطہ کا ازالہ

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو کہا کرتے ہیں کہ متاخرین نے اکابر

پرستی، پیر پرستی، معلّم پرستی کا بیج بوکر اللہ کے بندوں کے گلوں میں غلامی کا طوق ڈال دیا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کی اطاعت کا شریعت نے حکم دیا ہے بحد شرع انہی کی اطاعت کا متاخرین نے حکم کیا ہے بالخصوص جب کہ اصاغر میں آزادی پیدا ہونے سے دین سے بہت دور اور سکون و اطمینان سے بہت عاری ہوتے جاتے ہیں۔

دیکھئے باپ گھر کا حاکم ہے اور اس کی اطاعت کا حکم متعدد آیات و احادیث سے ثابت ہے تو اولاد کو باپ کی اطاعت کرنا کیا والد پرستی ہے؟ اسی طرح زوجہ کو شوہر کی اطاعت کرنا کیا شوہر پرستی ہے؟ ہرگز نہیں! اسی طرح معلّمین ظاہری اپنے متعلمین اور معلّمین باطنی اپنے مسترشدین کے حاکم ہوتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

(پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران)

"رسول ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔"

نیز حدیث شریف میں ہے:

﴿انما انا لکم مثل الوالد لولدہٖ﴾

(مشکوٰۃ باب الخلاء صفحہ ۴۲)

"(حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) میں تمہارے لئے مثل والد کے ہوں۔"

اور ایک حدیث میں ہے:

﴿ان العلماء ورثۃ الانبیاء﴾ (مشکوٰۃ صفحہ ۳۴)

"علماء انبیاء کے وارث ہیں۔"

اس حدیث کے ساتھ ما قبل کی دونوں حدیثوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ اساتذہ اور مشائخ مثل انبیاء کے معلّم اور مزکی بھی ہیں اور مثل والد کے شفیق و مربّی بھی ہیں پھر ان کی اطاعت کو اکابر پرستی سے تعبیر کرنا کم علمی ہی نہیں بلکہ جہل کی علامت ہے اور سخت غلطی اور گمراہی پر مبنی ہے کیونکہ علماء اور مشائخ کی اطاعت کو اکابر پرستی سے تعبیر کرکے عوام کو اس سے آزاد کرنا یہ عوام کے دین و دنیا دونوں کی بربادی کا باعث ہے جیسا کہ آج کے دور میں اس کا کھلا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

یہ تمام بحث شوریٰ اور اولی الامر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے درمیان میں آگئی تھی جو مفید ہونے کی وجہ سے ذرا تفصیل سے لکھ دی گئی۔ سابق میں عرض کیا جاچکا ہے کہ مشورہ، مشاورت اور شوریٰ کی حقیقت کسی امر میں صرف مختلف رائیں معلوم کرنا ہے۔ اور مشورہ دینے والوں کا کام صرف اپنی اپنی رائیں اس امر کے بارے میں ظاہر کردینا ہے، لیکن ان رایوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا یا ان سب رایوں کو چھوڑ کر اپنی رائے پر عمل اور اس کو نافذ کرنے کا حق صرف اولی الامر (یعنی حاکم) کو ہے خواہ وہ حاکم گھر کا ہو جیسے والد یا، اقامت نماز کا ہو یعنی امام، یا مدرسہ کا ہو یعنی مہتمم، یا حج کرانے کا ہو یعنی امیر الحج، یا ملک کا ہو یعنی سلطان، یا شہر کا ہو یعنی عامل (کلکٹر)، یا لشکر کا ہو یعنی سپہ سالار (کمانڈر)، یا کچہری کا ہو یعنی قاضی (جج) وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ دنیوی و ملکی نظام قائم کرنے کے لئے ہر ہر محکمہ و شعبہ میں الگ الگ ذمہ دار و امیر ہوتا ہے۔ اور ان کے ماتحت ان کے تابع و مطیع ہوتے ہیں کیونکہ بغیر اس کے نظام ملکی و دنیوی درہم برہم اور تباہ ہو جاتا ہے۔

دیکھئے محکمہ ڈاک میں امیر ڈاک منشی (پوسٹ ماسٹر) ہوتا ہے۔ اسٹیشن کا امیر اسٹیشن ماسٹر ہوتا ہے، ریل کا امیر گارڈ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے حکم کے ڈرائیور گاڑی نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح ہر محکمہ کا معاملہ ہے کہ اس کا امیر کار اور اصل ذمہ دار ایک ہی ہوتا ہے۔ ضلع کا امیر کلکٹر اور کمشنری کا امیر کمشنر، صوبہ کا امیر گورنر ہوتا ہے، محکمہ پولیس کا امیر انسپکٹر جنرل، اور فوج کا امیر کمانڈر ہوتا ہے، پھر ہر ہر شعبہ کا

ایک وزیر ہوتا ہے۔ مثلاً وزیر خزانہ، وزیر داخلہ، وزیر خارجہ، وزیر دفاع، وزیر تعلیم وغیرہ اور ان سب کا امیر وزیر اعظم ہوتا ہے تو جب ملکی نظام و انتظام ہر ہر شعبے و محکمے کے الگ الگ متعین امیر کی اطاعت کے بغیر نہیں چل سکتا تو دین کا معاملہ بھی اسی طرح سمجھنا چاہئے۔

دین حسن انتظام میں سب سے اعلیٰ ہے

بلکہ دین تو حسن تنظیم اور تکمیل انتظام کا زیادہ سلیقہ اور حق رکھتا ہے، انسانی فطرت اور اختلاف طبائع سے زیادہ واقف ہے، اپنی ابتداء سے لے کر قیامت تک کے انقلابات زمانہ و تغیرات طبائع پر پوری وسعت نظری اور مکمّل عمق نگاہی کے ساتھ حاوی ہے، اس لئے فطرت صحیحہ اور مقتضائے عقل کی پوری رعایت اور طبائع انسانیہ کا نشیب و فراز اور ان کا انضباط بطریق احسن واکمل اس میں بیان کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کی زندگی میں اس کی تعلیمات و ہدایات بے حد مفید اور سکہ رائج الوقت کی طرح ہیں۔ چنانچہ اہل دنیا اور کفار نے ملکی (انتظام کا سلیقہ دین اسلام ہی سے سیکھا ہے دنیا اہل اسلام کا لوہا مانے ہوئے ہے۔ خلفاء راشدین کی ملکی تدابیر و انتظام دیکھ کر بڑے بڑے عقلاء حیران رہ گئے۔ اسی جامعیت اور اکملیت کے پیش نظر حق تعالیٰ نے شرعی اور فطری نظام قائم فرمانے کے لئے فرق مراتب کا ضابطہ مقرر فرما دیا اور ہر ہر شعبہ کے لئے تعیّن امیر اور اس کی اطاعت کو ماتحتوں کے لئے لازم قرار دے دیا ہے۔

ایک عیسائی کے اسلام لانے کا واقعہ

چنانچہ امام محمدؒ کی مبسوط (جس میں فقہ اسلامی کے دلائل بسط کے ساتھ مذکور ہیں) اس کو دیکھ کر ایک عیسائی عظمت شناس اسلام ہو کر مسلمان ہوگیا اور یہ کہا کہ "ھٰذا کتاب محمد کم الاصغر فکیف کتاب محمد کم الا کبر" جب

تمہارے چھوٹے محمدؒ کی کتاب ایسی ہے تو بڑے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کیسی ہوگی، ان کے علوم کا کیا ٹھکانا ہوگا۔

بیروت کے عیسائی ہدایہ پڑھ کر اسلامی نظام حکومت سے واقف ہوکر حکمرانی اور جہاں بانی کا طریق سیکھتے ہیں۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے بادشاہوں کے حکومت کرنے کے لئے گلستاں، بوستاں کتابیں لکھیں ہیں جن میں لکھا ہے کہ ہر ہر شعبہ کے لئے نگران مقرر کرو۔ انہیں کتابوں اور خلفاء راشدین کے اسلامی انتظام ملکی کے طریقوں سے عیسائیوں نے انتظام ملکی سیکھا ہے۔

اب سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ اغیار تو تمام شعبوں میں الگ الگ اور خاص خاص نگراں مقرر کریں اور ہر ہر شعبہ و محکمہ کے محکومین کو اس معین شخصیت کی اطاعت کا پابند بنائیں اور ہم لوگ باوجود اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی الاکلکم راعٍ وکلکم مسئولٌ عن رعیتہٖ (کہ کان لگا کر سن لو تم سب (اپنی اپنی ذمہ داری کے) نگراں ہو اور اپنی رعیت اور ماتحت امور کے بارے میں سوال کئے جاؤ گے) کے متبع نہ ہوں، اس ارشاد عالی نے ہر صاحب امر کو حاکم اور نگراں، ذمہ دار بنادیا۔ نیز حدیث شریف میں ہے:

﴿ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اسمعوا واطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان رأسہ زبیبۃ﴾ (مشکوۃ شریف ۳۱۹ قال الطیبی شبہ رأسہ بالزبیبۃ اما بصغرہ و اما لان شعور راسہ مقططۃ تحقیرا لشانہ۔ (مرقاۃ ۷/ ۱۹۹)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ حبشی غلام جس کا سر کشمش جیسا ہو تم پر حاکم

بنادیا جائے۔"

اس تشبیہ کے ذریعہ بتلا دیا کہ امیرو ذمہ دار اعلیٰ میں کچھ ناگواری کی چیزیں بھی ہوں تب بھی اس کی اطاعت اور ماتحتی میں رہنا ضروری ہے، مخالفت اختیار کرنے کا حق نہیں۔

اولی الامر صرف سلاطین و حکام میں منحصر کرنا درست نہیں

یہاں تک کے بیان سے بالصراحت یہ امر ثابت ہوگیا کہ اولی الامر کو صرف سلاطین و حکام میں منحصر سمجھ لینا اور دیگر اولی الامر کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ اہل علم پر مخفی نہیں کہ احادیث میں جیسے سلطان و امیر کے لئے امام کا لفظ مستعمل ہے اسی طرح نماز پڑھانے والے کے لئے بھی امام کا لفظ مستعمل ہے اسی واسطے فقہاء امامت صغریٰ اور امامت کبریٰ کے عنوان سے دونوں کے منصبوں میں فرق کرتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے:

﴿الجھاد واجب علیکم مع کل امیر برا کان اوفاجرا وان عمل الکبائر، و الصلوۃ واجبۃ علیکم خلف کل مسلم برا کان اوفاجرا وان عمل الکبائر﴾

(مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۰۰)

"جہاد تم پر ہر نیک و بد امیر کی ماتحتی میں واجب ہے اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو، اور نماز ہر نیک و بد مسلم کے پیچھے واجب ہے اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو۔"

اس حدیث مں دونوں اماموں کے بارے میں لوگوں پر اطاعت واجب ہونے

کے معاملہ میں یکساں الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، اسی طرح حج کے لئے ایک معین فرد کو امیر مقرر فرمایا چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آئے تو رمضان وشوال و ذیقعدہ تین ماہ ٹھہرے رہے اس کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنا کر حج کے لئے روانہ کیا۔ (اصح السیر صفحہ ۴۱۴)

اسی طرح زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھی عاملین ہوتے ہیں چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

﴿العامل علی الصدقة بالحق کالغازی فی سبیل اللّٰہ حتٰی یرجع الٰی بیتہٖ﴾ (مشکوٰۃ صفحہ ۱۵۷)

"کہ صدقہ پر حق کے ساتھ عامل مثل غازی فی سبیل اللہ کے ہے یہاں تک کہ اپنے گھر لوٹے۔"

دوسری حدیث میں ہے:

﴿عن جریر بن عبداللّٰہ قال جاء ناس یعنی من الاعراب الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالوا ان ناسا من المصدقین یاتونا فیظلمونا فقال ارضوا مصدقیکم و ان ظلمتم﴾ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۵۷)

"کہ جریر بن عبداللہ نے فرمایا کہ چند لوگ بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے سو انہوں نے کہا کہ کچھ لوگ صدقہ وصول کرنے والوں میں سے ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اپنے صدقہ وصول کرنے والوں کو راضی کرلو اگرچہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

دیکھئے یہاں عاملین صدقہ کو خوش رکھنے کی ویسی ہی تاکید ہے جیسی سلاطین کے بارے میں آئی ہے تو ثابت ہوگیا کہ عاملین صدقہ بھی ایک طرح کے امیر ہیں۔

بہر حال مندرجہ بالا بیان سے یہ بات بالکل منقح اور واضح ہوگئی کہ ہر ہر شعبہ و محکمہ میں ایک امیر ہونا اور بقیہ افراد کا اس کے ماتحت ہونا شریعت اسلامیہ کے مقاصد میں سے ہے یہ اسی لئے ہے کہ اگر زمام اختیار بجائے ایک کے چند افراد کے ہاتھ میں ہو تو عالم میں ضرور فساد آئے گا اور نظام و انتظام مختل ہو جائے گا۔ آیت کریمہ لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (پارہ:۱۷ سورۃ الانبیاء) میں اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔

سفر میں ایک کو امیر بنانے کی حکمت

چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث "کہ سفر میں جب تین آدمی ہوں تو ایک کو امیر بنالیں" کی شرح میں ارشاد فرماتے ہیں: "اس واسطے کہ سفر میں رائیں مختلف ہوتی ہیں اور جو کام ایک شخص سے متعلق نہ ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا"

(اکسیرہدایت صفحہ۲۲۹)

نیز عقل سلیم کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ مدار کار و نفاذ امر کسی شخص واحد ذمہ دار پر ہونا چاہئے کیونکہ انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اگر کسی معاملہ انتظامی اجتہادی میں اس کو خلاف طبع دبایا جاتا ہے تو اس کا دل مکدر و منقبض ہو جاتا ہے، اور اس کام کو جذبہ اور امنگ سے نہیں کرتا جیسا کہ اہل تجربہ، اہل عقل پر مخفی نہیں۔ اس لئے اگر امیر و ذمہ دار کو نفاذ امر میں مختار نہ رکھا جائے بلکہ اس کو چند افراد کے ماتحت کر دیا جائے خواہ وہ اس کے محکومین ہوں یا مشیر کار، تو ذمہ دار و امیر کار کو کام میں دلچسپی نہ رہے گی، ایسی صورت میں بالآخر یقیناً اس حکومت یا ادارہ و شعبہ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

الغرض نصاً و عقلاً و لغۃً ہر طرح ثابت ہوگیا کہ مشورہ کے بعد نفاذ میں امیر مختار ہوتا ہے اور مشوہ دینے والے اظہار رائے کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک مشوہ اور امارت کی حقیقت واضح کی گئی، آگے اسی کے متعلق چند

ضروری امر بیان کئے جاتے ہیں تاکہ اس باب میں مزید بصیرت ہوجائے اور بحث مکمل ہوجائے۔

محل مشورہ کون سے امور ہیں؟

امر اوّل: مشورہ کن امور میں ہوگا۔

❶ روح المعانی میں ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ای الحرب اوفیه وفی امثاله مماتجری فیه المشاورة عادةً والیه ذهب جماعة﴾

(روح المعانی جلد ۴ صفحہ ۱۶)

”ان سے خاص امور میں مشورہ لیتے رہا کیجئے یعنی جنگ میں یا اس میں اور اس جیسے تمام امور میں جن میں عادۃً مشورہ ہوتا ہے یہی ایک جماعت کا مذہب ہے۔“

❷ تفسیر مظہری میں ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ امر الحرب وغیره مما یتعلق بالمشاورة ولیس فیه عندک علم من اللّٰه تعالٰی﴾

(تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۱۶۱)

”ان سے خاص امور میں مشورہ لیتے رہئے۔ یعنی امر جنگ میں اور اس کے علاوہ دوسرے امور میں جن کا مشورہ سے تعلّق ہوتا ہے اور اس میں آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم نہ ہو۔“

❸ تفسیر خازن میں ہے:

﴿اتفق العلماء علٰی ان کل مانزل فیه وحی من اللّٰه تعالٰی لم یجز لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان یشاور فیه الامة و انما امر فیما سویٰ ذٰلک من امر الدنیا و مصالح الحرب و نحو ذٰلک﴾ (تفسیر خازن صفحہ ۲۹۶)

"علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر وہ چیز جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہو چکی ہو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت سے مشورہ لینا جائز نہیں ہے البتہ اس کے علاوہ دنیوی امور اور مصالح جنگ اور اسی کے مثل چیزوں میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔"

مندرجہ بالا تفاسیر سے یہ واضح ہو گیا کہ امیر، جنگ اور اس کے علاوہ ان تمام امور میں مشورہ لے سکتا ہے جن میں کوئی صریح نص نہ آئی ہو۔

مشورہ لینا مستحب ہے یا واجب

امر دوم: امیر کو مشورہ لینا واجب ہے یا صرف مستحب و مستحسن ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف کتب تفسیر سے اس کا حکم بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے:

﴿قال الحسنؒ و سفیان بن عیینة انما امر بذٰلک لیقتدی به غیره فی المشاورة و یصیر سنة فی امته﴾

(تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۴)

"حضرت حسن بصریؒ اور سفیانؒ بن عیینہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ کا حکم صرف اس لئے حق تعالیٰ نے دیا ہے کہ مشورہ لینے میں دوسرے آپ کی اقتداء

کریں اور یہ آپ کی امت کے لئے سنت بن جائے۔"

آگے لکھتے ہیں:

﴿وَشَاوِرْهُمْ یقتضی الوجوب و حمل الشافعی ذٰلک علی الاستحباب﴾ (تفسیر کبیر جلد ۹ صفحہ ۶۷)

"یعنی لفظ شاور وجوب کو مقتضی ہے مگر امام شافعیؒ نے اس کو استحباب پر محمول کیا ہے۔"

تفسیر مظہری میں گذشتہ عبارت کے بعد یہ ہے:

﴿استظهارًا برأيهم و تطييبًا لنفوسهم و تمهيدًا لسنة المشاورة للامة﴾ (تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۱۶۱)

"(آپ ان سے مشورہ لیا کیجئے) ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے اور ان کی دلجوئی کے لئے اور امت کے لئے مشاورت کو سنت بنانے کے لئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ تطییب قلوب اور سنت کی تمہید کے لئے تھا۔

احکام القرآن میں ہے:

﴿المشورة فیما بینهم فی مهمات امور فلم تکن المشورة مستحبة فی غیر المهمات﴾

(احکام القرآن صفحہ ۱۰۶)

"آپس میں مشورہ مہمات امور میں ہے پس غیر مہمات میں مشورہ مستحب نہ ہوگا۔"

اس سے مشورہ کا مستحب ہونا صراحۃً معلوم ہوتا ہے۔ خازن میں آیت مذکورہ کے تحت حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿قد علم اللّٰہ ان مابہٖ الٰی مشاورتھم حاجة ولکن اراد اللّٰہ ان یستن بہ من بعدہ من امتہٖ﴾

(تفسیر خازن صفحہ ۲۹۶)

"یقیناً خدائے تعالیٰ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ بعد کی امت کے لئے اس کو سنت بنادیں۔"

صاحب روح المعانی مشورہ لینے کے مختلف فوائد بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

﴿او ان تکون سنة بعدہ لامته والیه ذھب الحسن﴾

(روح المعانی پارہ: ۴ صفحہ ۱۶)

"یا ایک فائدہ اور مقصود یہ ہے کہ آپ کی امت کے لئے آپ کے بعد سنت ہوجائے حسن بصریؒ اسی جانب گئے ہیں۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:

﴿ویؤیدہ ما اخرجهٗ ابن عدی و البیھقی فی شعب الایمان بسند حسن عن ابن عباسؓ قال لما نزلت و شاورھم فی الامر قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الا ان اللّٰہ و رسوله لغنیان عنھا ولکن جعلھا اللّٰہ تعالٰی رحمة لامتی فمن استشار منھم لم یعدم رشد اومن ترکھا لم یعدم غیًّا﴾ (روح المعانی پارہ: ۴ صفحہ ۱۶)

"اور اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابن عدی اور بیہقی نے شعب الایمان میں بسند حسن ابن عباسؓ سے

روایت کیا ہے کہ جب آیت و شاورھم نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو! اللہ اور رسول اللہ کو تو مشورہ کی حاجت نہیں لیکن اللہ نے اس کو میری امت کے لئے رحمت بنایا ہے پس جو مشورہ لے گا رشد و ہدایت کو نہ کھوئے گا اور جو چھوڑدے گا بے راہی نہ کھوئے گا۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی حاجت نہ تھی اور شاور کے مخاطب اول آپ ہی ہیں۔ پس جب آپ کے لئے یہ صیغۂ امر وجوب کے لئے نہ تھا بلکہ امت کے لئے رحمت و سنت بنانا مقصود تھا اور وہ بھی سنت مؤکدہ نہیں بلکہ سنت مستحبہ اور مستحسن بنانا تھا، لفظ رحمت خود اسی کی طرف مشیر ہے۔

بہر حال مشورہ کا وجوب ثابت نہیں ہوا۔ اسی لئے اس کے فضائل تو بیان فرمائے لیکن ترک مشورہ پر توبیخ و زجر نہیں فرمایا بلکہ صرف مشورہ کی مدح فرمائی۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝﴾

(پارہ: ۲۵ سورۃ الشوریٰ)

"اور (اللہ کے پاس کی بہتر اور پائدار چیز ان لوگوں کے لئے ہے) جنہوں نے اپنے رب کا کہنا مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

یہاں اَقَامُوا الصَّلٰوةَ کے ساتھ مذکور ہونے سے مشورہ کے وجوب کا شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس کے بعد وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ بھی ہے اور

اقامت صلوٰۃ اور انفاق رزق نفلی طور سے بھی ہوتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے بھی اسی لئے شاور صیغہ امر کو ندب پر محمول فرمایا ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔

صاحب خلاصۃ التفاسیر فرماتے ہیں:

"امیر کو اپنے متعلّقین سے مشورہ لینا امر مستحسن ہے، بھروسہ اللہ ہی پر چاہئے مگر تدبیر احسن میں کمی نہ کرے۔ **مسئلہ:** شوریٰ اپنے تابعین سے واجب نہیں اولیٰ ہے ایسے ہی عفو و استغفار (ان کے لئے) واجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام امور مفید امیر معین رجوع عوام ہیں پس یہ قرینۂ استحباب ہے اور بسا اوقات انتقام، عفو سے انسب اور اخفاء، شوریٰ سے احوط ہوا کرتا ہے۔" (خلاصۃ التفاسیر پارہ: ۴ صفحہ ۳۱۲)

دیکھئے مفتی اعظم حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنویؒ صاحب خلاصۃ التفاسیر نے شوریٰ کے واجب نہ ہونے اور صرف اولیٰ ہونے کی یہ وجہ بھی کیا ہی عمدہ بیان فرمائی کہ بسا اوقات اخفاء، شوریٰ سے احوط ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ اگر آپ کو شمالی جانب غزوہ کرنا ہوتا تو جنوب کے حالات پوچھتے تاکہ مقام حرب کا اخفاء رہے۔

اسی طرح "مجالس الابرار" مؤلفہ شیخ احمد رومیؒ جس کی تعریف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ محدث دہلوی نے فرمائی ہے اس کے اردو ترجمہ نفائس الازہار میں ہے کہ جب کسی کام کا قصد کرے تو مستحب ہے کہ اس میں مشورہ کرے۔

(نفائس الازہار صفحہ ۳۰۶)

حق تنفیذ صرف امیر کو ہے

امر سوم: مشورہ نافذ کرنے کا حق امیر کو ہے یا مشیروں کو۔ بیانات سابقہ سے

واضح ہو چکا کہ امیر خواہ گھر کا ہو یعنی والد یا مدرسہ کا ہو یعنی مہتمم یا ملک کا ہو یعنی امام و سلطان وغیرہ اس کو مشورہ لینا صرف امر مستحسن ہے نیز مشیرین کا کام صرف اس کو مشورہ دینا اور اپنی رائے ظاہر کر دینا ہے۔

اب اگر امیر ان کے مشورہ پر عمل کرے تو عامل بالمشورۃ اس کو کہنا ظاہر ہے ہی لیکن اگر مشیرین کے مشورہ پر عمل نہ بھی کرے تب بھی مشورہ پر عامل اس کو ضرور کہا جائے گا کیونکہ مشیروں کے مشوروں کے ساتھ اس کا بھی ایک مشورہ شامل تھا اس نے اپنے مشورہ پر عمل کرلیا۔ پھر اگر مشیروں کے مشورہ پر عمل کرے تو اس کو یہ اختیار ہے کہ اکثریت کو ترجیح دے یا اقلیت کو کیونکہ وہ امیر ہے اور امیر بااختیار ہوتا ہے اور مشیر واحد ہو یا جماعت شوریٰ صرف مشورہ دینے والے ہیں بااختیار جماعت یا فرد نہیں جس کی وضاحت مختلف تفاسیر سے آیت فَاِذَا عَزَمْتَ کے تحت ماقبل میں آچکی ہے۔

اب ذیل میں بھی مزید تفاسیر مختلفہ سے اس کی تائید نقل کی جاتی ہے۔

❶ ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ ای اذا عقدت قلبک علی الفعل و امضائہ بعد المشاورۃ﴾ (روح المعانی پارہ: ۴ صفحہ ۱۰۷)

"پس جب آپ عزم کرلیں یعنی مشورہ کے بعد اس کام کے اجراء اور نفاذ پر آپ اپنے دل میں پختہ ارادہ کرلیں۔"

❷ ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ علٰی امضاء ماترید بعد المشاورۃ فتوکل علی اللّٰہ ثق بہ لا بالمشاورۃ﴾

(جلالین شریف پارہ: ۴ صفحہ ۶۳)

"پس مشورہ کے بعد آپ نے جس چیز کا ارادہ کیا ہے اس کے جاری کرنے کا جب آپ عزم کرلیں تو مشورہ پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے۔"

❸ ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فاذا قطعت الرای علی شئی بعد الشوریٰ﴾ (تفسیر مدارک پارہ: ۴ صفحہ ۱۵۰)

"پس جب آپ عزم کرلیں (یعنی) جب آپ کسی شئ پر بعد مشورہ کے قطعی رائے قائم کرلیں۔"

❹ ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ علیٰ شئی بعد المشورۃ﴾

(تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۱۶۴)

"جب آپ کسی چیز کا مشورہ کے بعد عزم کرلیں۔"

❺ ﴿فَاِذَا وطّنت نفسک علی شئی بعد الشوریٰ﴾

(تفسیر بیضاوی صفحہ ۹۴)

"جب آپ مشورہ کے بعد اپنی طبیعت کو کسی چیز پر جمادیں۔"

❻ ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ ای عقیب المشورۃ علی شئی و اطمأنت بہٖ نفسک﴾ (تفسیر روح البیان صفحہ ۱۱۶)

"پس جب آپ عزم کرلیں یعنی مشورہ کے بعد کسی چیز پر اور آپ کی طبیعت اس کے ساتھ مطمئن ہوجائے۔"

نیز بیان القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں تحریر ہے۔

"اور بدستور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے تاکہ ان کا اس سے اور دوناجی خوش ہو، پھر مشورہ لینے کے بعد جب ایک جانب رائے پختہ کرلیں خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو سو خدائے تعالیٰ پر اعتماد کرکے اس کام کو کر ڈالا کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے جو خدا تعالیٰ پر اعتماد رکھیں محبت فرماتے ہیں۔"

آگے فائدہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ جو کہا گیا کہ خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو دلیل اس کی یہ ہے کہ لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی اور اس سے معلوم ہوا کہ امور انتظامیہ متعلقہ بالرائے و المشورہ میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف نہ ہو۔" (بیان القرآن پارہ: ۴ صفحہ ۶۸، ۶۹)

دیکھئے ان تمام مفسرین نے ایک ہی بات بیان فرمائی ہے کہ بعد مشورہ آپ جس رائے کو چاہیں اختیار کرلیں خواہ جانب اقلیت کی یا جانب اکثریت کی یا خود اپنی، اگر مشورہ کے بعد فیصلہ کثرت رائے کے سپرد ہوتا تو فَاِذَا عَزَمْتَ کی بجائے فَاِذَا عَزَمُوْا جمع کا صیغہ آتا یا فَاِذَا عَزَمَ اَکْثَرُهُمْ فرماتے مگر ایسا نہیں فرمایا بلکہ واحد مخاطب کا صیغہ ارشاد فرمایا۔

ان تفصیلی بیانات و تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ امیر کو ہر طرح کا اختیار ہے۔ اس کی مزید مکمّل تائید "احکام القرآن للجصاص" کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

﴿وكان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اذا شاورهم فاظهروا آراء هم ارتأى معهم و عمل بما اداه اليه اجتهاده﴾ (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۴۱)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے تھے اور وہ اپنی اپنی رائیں ظاہر فرماتے تھے تو آپ بھی ان کے ساتھ رائے ظاہر فرماتے تھے اور جس طرف آپ کا اجتہاد پہنچتا عمل فرماتے تھے۔"

آگے مزید تفصیل فرماتے ہوئے صاحب احکام القرآن فرماتے ہیں:

﴿فجائز حینئذان توافق آراء هم رأی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم و جائزان یوافق رأی بعضھم وجائز ان یخالف رأی جمیعھم فیعمل صلی اللّٰہ علیہ وسلم حینئذ برأیہٖ﴾ (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۴۱)

"خلاصہ یہ کہ مشورہ میں تین صورتیں ہوسکتی تھیں یہ کہ مشورہ کے وقت صحابہ کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ بعض صحابہ کی رائے آپ کے موافق ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ تمام صحابہ کی رائے آپ کے خلاف ہو۔ بہر صورت آپ اپنی رائے پر عمل فرماتے تھے۔"

الغرض تفاسیر مذکورہ کے ساتھ احکام القرآن کی تشریح سے بھی یہ بالکل ثابت ہوگیا کہ نفاذ امر کا اختیار صرف امیر کو ہے۔

دستور غیر شرعی: یہاں سے ظاہر ہوگیا کہ ہمارے دینی اداروں میں جس جگہ کہ امیر کو مامور اور مشیروں کو امیر کا درجہ دے دیا گیا ہے وہ دستور غیر شرعی ہے۔ یہ غیر شرعی چیز بعض دینی اداروں میں اغیار سے اخذ ہوگئی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دینی اداروں سے اس کو دور کرکے دستور کو شرعی اصول کے مطابق ہی رکھا جائے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اور ایسے غیر شرعی نظام پر ملک کے جمہوری طرز حکومت سے استدلال کرنا خصوصاً اہل علم سے بڑی حیرت کی بات ہے کیونکہ مندرجہ بالا بیانات سے منقح ہوگیا کہ شرعی نظام حکومت میں نہ خالص شخصی (ڈکٹیٹر شپ) حکومت کا جواز ہے نہ جمہوریت (سیکولزم) کا جواز ہے بلکہ ایک ایسا امیر ہو جو مشورہ سے نہ تو مستغنی ہو اور

نہ مشیروں کا تابع ہو کیونکہ شریعت محمدیہ میں افراط تفریط نہیں، اعتدال اور توسط ہے
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ (پارہ:۲ سورۃ البقرۃ)

لیکن مروجہ جمہوریت میں فیصلہ اکثریت پر ہوتا ہے اور امیران کے تابع ہوتا ہے جو بالکل خلاف عقل و فطرت ہے۔

آپ گھر کی حکومت کو لے لیجئے کیا اولاد کثرت رائے سے اپنے باپ کی حکم عدولی کر سکتی ہے اور یہ کہہ سکتی ہے کہ ہم کمارہے ہیں لہٰذا آپ ہمارے نوکر ہیں سبزی، گوشت وغیرہ سودا لائیے۔ اور جو ہماری شوریٰ پاس کرے وہ کیجئے، ہرگز نہیں کوئی عاقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ باپ حاکم ہے، بیوی اور اولاد اس کی رعیت ہے، سب کو اس حاکم کی اطاعت و احترام واجب ہے یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر والدہ ایک حکم کرے اور والد دوسرا، تو اطاعت والد کی کی جائے گی۔ کیونکہ وہ دونوں کا امیرو حاکم ہے البتہ حسن سلوک میں والدہ مقدم ہے۔

اسی طرح اگر امام اور مقتدیوں کے درمیان تعداد رکعات میں اختلاف ہو جائے کہ کتنی رکعات پڑھی گئی تو امام کی رائے مانی جائے گی خواہ مقتدیوں کی کتنی ہی کثرت ہو۔ (بعض صورتوں میں یہی حکم ہے تفصیل کتب فقہ سے معلوم ہوسکتی ہے ۱۲ نصیر احمد عفی عنہ)

اسی طرح ادارہ میں احکام مہتمم ہی کے نافذ ہوں گے۔ مشیران ادارہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم تو ادارہ کے نوکر ہو، ہیئۃ حاکمہ شوریٰ کو حاصل ہے جو شوریٰ کہے وہ کرو۔ کیونکہ ادارہ کے اندر مہتمم حاکم ہے اور وہ اختیار کامل رکھتا ہے اس میں اور سلطان میں اتنا فرق ہے کہ اس کے ہاتھ میں قوت قاہرہ فوج و خزانہ، پولیس وغیرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ حدود جاری نہیں کر سکتا ورنہ اس کا مقام بھی مثل مقام امارت ہے دیگر سارے افراد ادارہ اس کے مطیع و ماتحت ہیں البتہ مہتمم کو بحیثیت امیر مشیروں سے مشورہ لینا مستحسن ہے لیکن بعد مشورہ ان میں سے کسی ایک مشورہ کو خواہ اکثریت کا ہو خواہ اقلیت کا یا خود اپنا اس کے نافذ کرنے کا اختیار کلی مہتمم ہی

کو بحیثیت امیر ادارہ حاصل ہے۔ کیونکہ امور انتظامیہ غیر منصوصہ میں اہل تجربہ کی رائے مقدم ہوتی ہے اور مہتمم کو امور انتظامیہ میں جتنا تجربہ ہوتا ہے مشیروں اور اہل شوریٰ کو اتنا نہیں ہوتا کیونکہ امور انتظامیہ متعلّقہ مدرسین، طلبہ، ملازمین و رابطۂ عوام نیز ادارہ کے دیگر تمام شعبہ جات کے اندرونی و بیرونی حالات میں ہر وقت مہتمم ہی کو سابقہ پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کو جو تجربہ ہوتا ہے شوریٰ کو کہاں؟ سو مہتمم جب صاحب معاملہ اور اہل تجربہ ہے تو اسی کی رائے کو ترجیح ہوگی۔

ایسے ہی دنیوی امور متعلّقہ بالتجربہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد کے مقابلہ میں صحابہ کرام کے تجربہ کو ترجیح دی ہے جس کی نظیر "تابیر نخل" ہے جو کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔

نیز سیر کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر ایک مقام پر روانہ فرمایا جس میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ تھے مگر امیر لشکر ایک معمولی درجہ کے صحابی کو بنایا۔ جب اس مقام پر رات کو پڑاؤ ہوا تو امیر لشکر نے حکم دیا کہ جگہ جگہ آگ روشن کی جائے۔ جلیل القدر صحابہ نے اس پر نکیر فرمائی کہ آگ کہ دوزخ اس کا محل ہے آپ اس کا حکم فرماتے ہیں۔ امیر لشکر نے فرمایا کہ میں امیر ہوں آپ کو میرا حکم ماننا چاہئے چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ جب اس مہم سے فارغ ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو اس واقعہ کو ذکر کیا گیا، آپ نے امیر لشکر سے معلوم فرمایا کہ تم نے آگ روشن کرنے کا حکم کیوں دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب لشکر میں جابجا آگ روشن کی جاتی ہے تو لشکر کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے، میں نے اپنی کثرت تعداد ظاہر کرکے دشمن کے دل میں اپنی دھاک بٹھانا چاہی اس لئے ایسا کیا۔ آپ نے یہ وجہ سن کر ان کی تصویب فرمائی۔ اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ امور متعلّقہ بالتجربہ میں امیر کی رائے مقدم ہوتی ہے۔

غرض ثابت ہوا کہ جو امور تجربہ اور معاملہ سے متعلّق ہوں اس میں صاحب

تجربہ اور صاحب معاملہ کی رائے کو ترجیح ہوگی۔ یہی حال مہتمم و شوریٰ کا ہے کہ شوریٰ کو وہ تجربہ کہاں ہے جو مہتمم کو ہے۔ غرض ایسے معاملات میں مہتمم کی رائے کو ترجیح ہوگی۔

بات یہ چل رہی تھی کہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے امیر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے چاہے وہ حکم طبائع پر کتنا ہی ناگوار گذرے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے۔"

❶ ﴿عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من رأی من امیره شیئًا یکرهه فلیصبر فانهٗ لیس احدیفارق الجماعة شبرًا فیموت الامات میتة جاهلیة﴾ (مشکوٰۃ شریف کتاب الامارۃ صفحہ ۳۱۹)

"حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے امیر سے کوئی ناپسند بات دیکھے تو اس کو صبر کرنا چاہئے اس لئے کہ کوئی ایسا نہیں جو جماعت سے بالشت بھر جدا ہو پھر مرجائے مگر جاہلیت کی موت مرے گا۔"

❷ ﴿عن عبداللّٰه بن مسعود قال قال لنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم سترون بعدی اثرة و امورًا تنکرونها قالوا فما تامرنا یا رسول اللّٰه قال ادوا الیهم حقهم وسلوا اللّٰه حقکم﴾

(مشکوٰۃ شریف کتاب الامارۃ صفحہ ۳۱۰)

ؔلہ وفی روایة من خرج من السلطان قید شبر مات میتة جاهلیة رواه بخاری و مسلم۔
نبراس ۳۲۳

"عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میرے بعد خود کو ترجیح دینا اور ایسے امور دیکھو گے جو تم کو ناپسند ہوں گے صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ایسے وقت کے لئے) آپ ہم کو کیا حکم فرماتے ہیں فرمایا کہ تم ان کا حق ادا کرو اور اپنا حق اللہ تعالیٰ سے مانگو۔"

یہی سبب ہے کہ حجاج بن یوسف کے مظالم پر بھی صحابہؓ نے صبر ہی کا حکم دیا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عن الزبیر بن عدی اتینا انس بن مالک نشکوا الیه مانلقی من الحجاج فقال اصبروا الخ﴾

(مشکوۃ شریف کتاب الامارۃ صفحہ ۳۱۹)

"زبیر بن عدی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا ہمارے پاس حضرت انس بن مالکؓ تشریف لائے تو ہم حجاج بن یوسف سے جو اذیتیں پہنچ رہی تھی ان کی شکایت کرنے لگے۔ آپ نے ارشاد فرمایا صبر کرو۔"

مُلّا جیون رحمۃ اللہ علیہ تفسیرات احمدیہ میں فرماتے ہیں۔

﴿والتابعون کانوا یقلدون من الحجاج مع انه کان سلطانا جائرا کما نطق به فی الهدایة﴾

(تفسیرات احمدیہ صفحہ ۲۸)

"کہ تابعین حجاج بن یوسف سے عہدہ قبول کرتے تھے باوجودیکہ وہ سلطان ظالم تھا جیسا کہ ہدایہ میں بیان کیا گیا ہے۔"

حاصل یہ کہ باوجود امیر کی کوتاہیوں کے صبر و سکوت کے ساتھ حضرات تابعینؒ ماتحتی رکھتے تھے۔ لہٰذا ہمیں سلف صالحین کی اتباع کرنی چاہئے، ان کے طرز عمل کو اپنانا چاہئے وہ علم و عمل و فقہ فی الدین میں ہم سے کہیں زیادہ فائق و برتر تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ (پارہ:۲۱ سورۃ لقمان)

"ان لوگوں کے طریق کا اتباع کیجئے جو میری طرف رجوع ہوں۔"

اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے اس میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔

اطاعت امیر و اقتداء خلیفہ کی شریعت میں یہاں تک تاکید ہے کہ جو امام فاسق ہو اس کی امامت میں بھی جہاد کرنے اور نماز پڑھنے کا حکم حدیث شریف میں وارد ہے جس کا ذکر ہو چکا۔

اطاعت امیر کی حکمت

اطاعت حکم امیر میں (چاہے وہ گھر کا ہو یا مدرسہ کا یا امامت نماز کا یا حج کا، حکمت یہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کا نظام مختل نہ ہو، انتشار پیدا نہ ہو، اتحاد و اجتماع کی قوت باقی رہے اگر خلاف طبع امور کو برداشت نہ کیا جائے اور اطاعت امیر نہ ہو، اس سے اختلاف و خلاف کیا جائے تو اس سے جو مفاسد ہوں گے وہ موجودہ ناگوار خامیوں سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے لہٰذا اذا ابتلیت ببلیتین فاخترا ھونھما کے اصول کے پیش نظر موجودہ خامیوں کو گوارا کرنا ضروری ہے۔

غرضیکہ نظام عالم کے قیام پر سکون کا مدار بڑوں کی اطاعت ہی پر ہے۔

دنیا میں شرعی مصالح کے علاوہ تکوینی مصالح عقلاً و طبعاً غور فرمائیں کہ ہر باپ اپنے بیٹے سے، مرشد اپنے مرید سے، استاذ اپنے شاگرد سے، رہبر و لیڈر اپنے پیروں

سے، سپہ سالار اپنے فوجیوں سے، افسر اپنے ماتحتوں سے، اور بادشاہ اپنی رعایا سے فرمانبرداری کا خواہاں ہے۔

اور ماتحت کے حق میں یہی مفید ہے کہ وہ حق فرمانبرداری بجالائے اسلاف کا اپنے اپنے شعبوں میں درجۂ کمال تک پہنچنے کا راز یہی تھا کہ انہوں نے اپنے بڑوں کی نہایت اخلاص کے ساتھ اطاعت و اتباع کی ہے۔ ان کا ادب و احترام اپنے قلوب میں جمائے رکھا۔ اگر کوئی امر منکر کسی امیر سے پیش آیا تو حق بات تو کہدی اور پھر فارغ ہو گئے اور شرعی حدود (یعنی جب تک صریح حکم شریعت کے خلاف حکم نہ ہوا) میں رہ کر اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچا۔ چنانچہ حق بات کہنے کی تو یہ دلیل ہے:

﴿قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر﴾ (مشکوۃ شریف صفحہ ۳۲۲)

"افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہی جائے۔"

اور حق بات کہنے کے بعد شرعی حدود میں رہ کر اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچنے کا امر اس حدیث میں ہے:

﴿عن عوف بن مالک الاشجعیؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خیار ائمتکم الذین تحبو نھم و یحبونکم و تصلون علیھم و یصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم و تلعنونھم ویلعنونکم قال قلنا یا رسول اللّٰہ افلاننا بذھم عند ذٰلک قال لاما اقاموا فیکم الصلٰوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلٰوۃ اَلاَ من وُّلی علیہ وال فرأہ یأتی شیئاً من معصیۃ اللّٰہ تعالٰی فلیکرہ مایأتی من معصیۃ اللّٰہ ولاینزعن

یدا من طاعة ﴾ (مشکوۃ شریف صفحہ ۳۱۹)

''عوف بن مالک اشجعیؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، تمہارے امیروں میں بہتر وہ ہیں جن سے تم محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت رکھتے ہیں اور جن کے لئے تم دعاء کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے دعاء کرتے ہیں، اور تمہارے برے امیر وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور وہ تم سے بغض رکھتے ہیں اور جن پر تم لعنت کرتے ہو اور وہ تم پر لعنت کرتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا اس وقت ہم ان سے عہد اطاعت نہ توڑیں، آپ نے فرمایا نہیں جب تک تم میں نماز قائم کریں (پھر مکرر ارشاد فرمایا) نہیں جب تک وہ تم میں نماز قائم کریں یاد رکھو جس پر کوئی حاکم مقرر کیا جائے پھر دیکھے کہ وہ حاکم اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اس معصیت کو ناپسند کرے لیکن اس کی اطاعت سے ہرگز ہاتھ نہ کھینچے۔''

لہٰذا ادارے کے تمام ماتحتوں کو بموجب نصوص اپنے اپنے امیروں کی اطاعت لازم ہے۔ اس کو اپنا ہمدرد سرپرست، بہی خواہ سمجھنا چاہئے، اس سے کوئی غلطی ہو تو ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرعی حدود میں رہ کر حق بات تو کہی جاسکتی ہے لیکن برسرعام کہنے سے تو فتنہ و فساد ہی کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور ان سب باتوں کی شریعت میں سخت ممانعت ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

﴿ان من اربی الربوا الاستطالة فی عرض المسلم بغیر حق ﴾ (مشکوۃ شریف صفحہ ۴۲۹)

''ناحق مسلمانوں کی آبروریزی کرنا سب سے بڑا سود ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے:

﴿عن ابن عمرؓ قال صعد رسول اله صلی اللّٰہ علیه وسلم علی المنبر فنادی بصوت رفیع یا معشر من اسلم بلسانه ولم یفض الایمان الٰی قلبه لاتوذوا المسلمین ولا تعیر وهم ولا تتبعوا عوراتهم فانه من یتبع عورة اخیه المسلم یتبع اللّٰہ عورته ومن یتبع اللّٰہ عورته یفضحه ولو فی جوف رحله﴾ (مشکوۃ شریف صفحہ۴۲۹)

”حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر چڑھے اور بلند آواز سے پکار کر فرمایا کہ اے ان لوگوں کی جماعت جو اپنی زبان سے ایمان لئے لیکن ایمان ان کے دل تک نہیں پہنچا تم مسلمانوں کو تکلیف نہ دو اور نہ ان کو عار دلاؤ اور نہ ان کے عیوب کے پیچھے پڑو اس لئے کہ جو اپنے بھائی مسلمان کے عیب کے پیچھے پڑتا ہے اللہ اس کے عیب کے پیچھے پڑجاتا ہے اور اللہ جس کے عیب کے پیچھے پڑجاتا ہے اس کو رسوا کردیتا ہے اگرچہ وہ اپنے گھر کے بیچ میں ہو۔“

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس طرح بر سرعام تنقید و تخطیہ سے جو فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے وہ حق تعالیٰ کو سخت مبغوض ہے اسی لئے جب حق تعالیٰ نے فرشتوں میں حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی خلافت کا اعلان فرمایا تھا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا:

﴿اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾

(پارہ:۱سورہ البقرۃ)

"کیا آپ زمین میں ان کو خلیفہ بنارہے ہیں جو اس میں فساد اور
خوں ریزی کریں گے۔"

ظاہر ہے کہ فرشتوں نے انسانی خامیوں میں سے جو زیادہ مبغوض عنداللہ ہیں انہی کا تذکرہ کیا ہے اور وہ فساد ہے، اور خون ریزی اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ حق تعالیٰ نے خود جگہ جگہ کلام پاک میں فساد کی مبغوضیت بیان فرمائی ہے جیسے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۝﴾ (پ۲۰ سورۃ القصص)

"اللہ تعالیٰ یقیناً مفسدوں کو پسند نہیں فرماتے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۝﴾ (پارہ:۲۰ سورۃ القصص)

"یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کریں گے جو دنیا
میں نہ تو برائی چاہتے ہیں اور نہ فساد۔"

لہٰذا ادارہ کے ہر ماتحت کو فتنہ و فساد سے دور رہ کر اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مشغول رہنا چاہئے۔ اگر مدارس دینیہ میں رہ کر فتنہ و فساد سے بچے رہنے کی طبیعت نہ بنی تو پھر مدارس سے نکلنے کے بعد کیا امید کی جاسکتی ہے شیخ ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں:

﴿من لم یتادب للوقت فوقته المقت﴾

"جس نے موقعہ پر ادب نہ سیکھا اس کا وہ وقت ناراضگی (الٰہی)
ہے۔"

یہ بات ذہن نشیں کرلینا چاہئے کہ دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں سارے امور اپنی مرضی کے موافق ہوں اس بات کی امید و توقع ایک لاحاصل چیز

ہے۔ حق تعالیٰ ایسی تمنّا اور امید پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی﴾ (پارہ: ۲۷ سورۃ النجم)

"کیا دنیا میں انسان کو ہر وہ چیز مل سکتی ہے جس کی تمنّا کرے۔"

استفہام انکاری ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا، دوسری آیت میں ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ (پارہ: ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل)

"جو شخص دنیا چاہتا ہے ہم دنیا میں جو چاہتے ہیں جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔"

اس سے، بھی معلوم ہوا کہ انسان کی ہر تمنّا پوری نہیں ہوتی بلکہ جس کو حق تعالیٰ دینا چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔ اسی کو کسی نے خوب نظم کیا ہے ؎

ما کل ما یتمنی المرء یدرکه
تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

ایسا نہیں کہ جس چیز کی انسان تمنّا کرے اس کو پالے بہت سی ہوائیں کشتی کے ناموافق چلتی ہیں۔ البتہ جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں کی تمام نعمتیں حسب دلخواہ ہوں گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ﴾

"تمہارے لئے جنت میں حسب خواہش نعمتیں ہوں گی۔"

مہتمم سے اپنی مرضی کے موافق چاہنا غلط ہے

اس لئے کسی ادارہ اور مہتمم سے یہ توقع رکھنا کہ ہماری خواہش کے موافق سارا نظام ہو یہ بے محل ہے، امیر و مہتمم کی اصلاح کے بجائے خود اپنی اصلاح کا اہتمام

ہونا چاہئے اور امیر و مہتمم سے تصادم کے تمام طرق سے اجتناب رکھنا چاہئے۔ اگر کسی وجہ سے ان کی باتوں کا تحمل اور اس کی ہمت نہ ہو تو نہایت خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے بدون اظہار کشیدگی اور بدون درپئے آزار ہوئے خودبخود الگ ہوجانا چاہئے ۔

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ماغیرازیں گنا ہے نیست

کسی کے ستانے کے پیچھے مت پڑو اور جو چاہو کرو کہ ہماری شریعت میں اس سے بدتر کوئی گناہ نہیں ہے۔

جدال و نزاع شانِ اہل علم کے بالکل خلاف ہے

غرضیکہ ادارے کے اندر لڑائی جھگڑے، فتنہ و فساد، جدال و نزاع اہل علم کی شان و وقار اور ان کے بلند مقام کے سراسر خلاف ہے۔ اہل علم کی تو یہ شان ہونا چاہئے جس کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

خودچہ جائے جنگ و جدل و نیک و بد
کیں دلم از صلحہا ھم می رمد

یعنی لڑائی اور جھگڑے کی تو یہاں کہاں گنجائش ہے یہ دل تو زیادہ صلح اور دوستوں سے بھی گھبراتا ہے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ۔

شنیدم کہ ۔ مردان راہ خدا
دل دشمنان ہم نکرد ند تنگ
ترا کے میسر شودایں مقام
کہ بادوستانت خلافست و جنگ

میں نے سنا ہے کہ راہ خدا کے جو انمرودوں نے دشمنوں کا بھی کبھی دل نہیں دکھایا۔ تجھ کو یہ مرتبہ کیسے میسر ہو کیونکہ تیری تو اپنے دوستوں سے ہی مخالفت اور لڑائی ہے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ ادارے کے ہر ماتحت کو ان تمام اسباب سے جو فتنہ و فساد کی طرف منجر (لے جانے والے) ہوں دور رہ کر ہمہ تن اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول رہنا چاہئے کیونکہ اپنے امیر کی محبت و عظمت، ادب و احترام لازم ہے، اس کو اپنا سرپرست اور خیر خواہ سمجھیں اس پر اعتماد اور اس کے ساتھ حسن ظن رکھیں اور اس کو بڑی عبادت سمجھیں، ارشاد نبوی ہے: حسن الظن من حسن العبادة جیسا کہ ابھی ماقبل میں گذرا، نیز مہتمم کے انتظامی امور میں داخل نہ دیں نہ طلباء نہ مدرسین نہ مشیرین، سب اپنا اپنا کام کریں، مشیرین کا کام تو صرف مشورہ دینا ہے اور طلباء کا کام پڑھنا ہے، مدرسین کا کام پڑھانا، پس ان تینوں حضرات کا انتظامی امور میں دخل دینا اپنی حد سے نکلنا اور قلب موضوع ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کا ارشاد گرامی

میں ایک مرتبہ پاکستان گیا ہوا تھا وہاں میرا اور شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کا ایک سواری میں ساتھ ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا، دوران گفتگو مولانا نے فرمایا تمام عمر کے تجربہ سے یہ بات محقق ہوگئی کہ مدرسین کا کام تو صرف درس و تدریس ہے، امور انتظامیہ کو مہتمم جانے، ان کو تو امور انتظامیہ میں بالکل دخل نہ دینا چاہئے بس ان کو تو پڑھنے پڑھانے میں لگا رہنا چاہئے۔

مولانا موصوف بڑے بڑے متعدد مدارس میں رہے ہیں اور بعض اختلافات میں بھی ایک مرتبہ شریک ہوگئے تھے ان تمام تجربات کے بعد ان کی مذکورہ پختہ رائے

قائم ہوئی ہے تو ان کی رائے کتنی وزن دار اور قابل عمل ہوگی ظاہر ہے۔

جب مدرسین ہی کو انتظامیہ میں دخیل نہیں ہونا چاہئے تو طلبہ کو تو بدرجۂ اولیٰ دخیل ہونے سے الگ رہنا ضروری ہے اور مشیروں کو بھی دخیل اس لئے نہیں ہونا چاہئے کہ ان کا کام صرف مشورہ دینا ہے اور بس۔ جیسا کہ مشورہ کا طریق ہے جس پر اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظائر آگے آرہے ہیں نیز مشیرین حضرات صاحب معاملہ نہیں اس لئے نشیب و فراز اور طبائع طلبہ اسی طرح دیگر امور انتظام سے سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے بروقت کسی امر میں حقیقت شناسی سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض مرتبہ مدرسہ کے بعض صاحبان اپنے معاملہ کو ممبران شوریٰ کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کے ممبران میں سے بھی بعض یا اکثر ان کی غلط بات کو عدم تجربہ اور سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے سچ سمجھ لیتے ہیں اور ان کی بات قبول کرلیتے ہیں جس سے طلبہ اہتمام کے مقابلہ میں جری ہوجاتے ہیں جو طلبہ و ادارہ دونوں کے لئے سخت خسارہ کی بات ہے۔ پھر جیسا کہ سابقاً مذکور ہوا بڑوں سے بھی اگرچہ اجتہادی خطا ہوجاتی ہے مگر اس پر گرفت غلط اور ناجائز ہوتی ہے پھر اس غلطی کو اچھال کر اہتمام پر تبصرہ اور اس کی تنقیص تخطیہ پھر خلاف و جدال وغیرہ خرابیاں ظہور میں آتی ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔

صحابہ رضؓ کا تخطیہ ناجائز اور بعض اہل قلم کی غلطی

جب مندرجۂ بالا تفصیل سے یہ بات منقح ہوگئی کہ خطاء اجتہادی تو بڑوں سے بھی ہوسکتی ہے لیکن ان پر تنقید و تبصرہ وغیرہ برسرعام کرنے سے گریز لازم ہے۔ تو یہاں سے بعض ان اہل قلم کا غلطی پر ہونا معلوم ہوگیا جو بغیر نص صریح کے محض تاریخی واقعات پر اعتماد کرکے یا صرف ظن و تخمین سے کسی صحابی کو خطاء سے موسوم کرکے برسرعام اپنی تقریروں تحریروں میں تنقید و تبصرہ کرتے ہیں، اپنی تقریر و تحریر کی رو میں حد سے متجاوز ہوجاتے ہیں جرءت اور بیباکی سے تنقید و اعتراض کرتے ہیں

اور اس کی برائی محسوس نہیں کرتے، حالانکہ صحابہؓ میں سے بہت سے حضرات کے خاص خاص فضائل اور تمام صحابہؓ کے عام فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں اور ان فضائل کا لحاظ رکھنا امت پر لازم فرمادیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ان شرار امتی اجرءھم علی اصحابی﴾

(رواہ ابن عدی)

"میری امت کے بدترین افراد میرے صحابہ پر جرأت کرنے والے ہیں۔"

اور ارشاد ہے:

﴿لعن اللّٰہ من سبہ اصحابی﴾ (رواہ الطبرانی)

"لعنت کرے اللہ تعالیٰ ان پر جو میرے صحابہؓ کو برا کہیں۔"

اور ارشاد ہے:

﴿ان اللّٰہ اختارنی و اختارلی اصحاباً فجعل لی منھم وزراء و انصارا فمن سبھم فعلیہ لعنۃ اللّٰہ و الملٰئکۃ والناس اجمعین ولا یقبل اللّٰہ منھم صرفا ولا عدلاً﴾

(مظاہر الحق جلد ۴ صفحہ ۵۷۸)

"اللہ تعالیٰ نے مجھ کو منتخب فرمایا اور میرے لئے ساتھی مقرر فرمائے جن میں سے میرے معاون و مددگار بنائے جو انھیں برا کہے اس پر اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کی تمام لوگوں کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ ان برا کہنے والوں کا فرض نفل کچھ قبول نہ فرمائیں گے۔"

اور ایسی احادیث کثیر در کثیر ہیں جن میں صحابہ کے بارے میں بدزبانی بدگمانی کرنے پر ان کی عظمت و محبت کے خلاف بغض و نفرت کا برتاؤ کرنے پر سخت وعیدیں وارد ہیں۔

عظمت صحابہؓ

اور کیوں نہ ہوں فی الواقع حضرات صحابہ کی ذوات باصفات وہ ہیں کہ اگر قرآن و حدیث میں ان کے فضائل وارد نہ ہوتے تب بھی ان کے کارنامے ایسے ظاہر و باہر ہیں جن کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام پر حضرات صحابہ کا اپنی جانیں اور مال اور اولاد سب کو قربان کردینا اور ہر کام پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضیات کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا اور اس کے لئے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پہلی امتوں میں نہیں ملتی۔

دوسرے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور صدور خطا کے وقت ان کا خوف و خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے کو سزا جاری کرنے کے لئے پیش کردینا اور اس پر اس اصرار کرنا روایات و احادیث میں معروف و مشہور ہے جو اہل علم پر پوشیدہ نہیں۔

تیسرے اقامت دین اور نصرت اسلام کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عسرت و تنگدستی اور مشقت و محنت کے ساتھ ایسے معرکے سر کرنا جس کی اقوام عالم میں نظیر نہیں، اسی لئے علامہ سفارینیؒ فرماتے ہیں۔

﴿لولم یرد عن اللّٰه ولا عن رسوله فیهم شئی لا وجبت الحال التی لانوا علیها من الهجرة والجهادو نصرة الدین وبذل المهج والاموال وقتل الاباء والا ولاد و

المناصحة فی الدین وقوة الایمان و الیقین القطع بتعدیلھم والاعتقاد لنزاھتھم وانھم افضل جمیع الامة بعد نبیھم ھٰذا مذھب کافة الامة ومن علیه المعول من الائمة ﴾ (عقیدہ سفارینؒ جلد۲ صفحہ ۳۳۸ بحوالہ مقام صحابہ)

"اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی فضیلت میں کوئی بات بھی منقول نہ ہوتی تب بھی ان کی عدالت پر یقین اور پاکیزگی کا اعتقاد رکھنا اور اس بات پر ایمان رکھنا ضروری ہوتا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساری امت کے افضل ترین افراد ہیں اس لئے کہ ان کے تمام حالات اسی کے مقتضی تھے انہوں نے ہجرت کی، جہاد کئے، دین کی نصرت میں اپنی جان مال کو قربان کیا، اپنے اعزہ اقارب کو حتی کہ باپ کی، بیٹوں کی قربانی پیش کی، دین کے معاملہ میں باہمی خیرخواہی کی اور ایمان ویقین کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔"

حق تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت کے لئے منتخب فرمایا اور دین کا ان کو واسطہ اور رابطہ بنایا تو ان کو یہ خصوصی اعزاز بھی عطا فرمایا کہ اسی دنیا میں ان سب حضرات کی خطاؤں سے درگذر اور معافی اور اپنی رضا و رضوان کا اعلان بھی کردیا اور ان کے لئے جنت کا وعدہ قرآن پاک میں نازل فرمایا، ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝﴾ (پارہ:۱۰ سورۃ التوبہ)

اس آیت شریفہ میں تمام مہاجرین کے بارے میں حق تعالیٰ نے تعریف و

توصیف میں فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو خدا کی راہ میں لگادیا ان کے خدا کے نزدیک بہت بڑا مرتبہ ہے یہ لوگ پورے کامیاب ہیں اس پر پروردگار نے اپنی طرف سے بڑی رحمت و رضوان اور دائمی نعمتوں والے باغات کا انعام فرمایا۔

اسی طرح سورہ انفال میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۝﴾

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے تمام مہاجرین و انصار کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے سچے پکے مومن ہونے کی شہادت دی ہے اور مغفرت و رزق کریم کا وعدہ فرمایا ہے۔

اسی طرح آیت:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾

(سورۃ توبہ)

میں تمام صحابہ کے لئے رضی اللہ تعالیٰ عنہم کہ اللہ ان سے سب راضی ہوگیا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کو سب اگلی پچھلی چیزوں کا علم ہے لہٰذا کسی کے واسطے رضاء الٰہی کا اعلان اس کی ضمانت ہے کہ اس کا خاتمہ اور انجام بھی حالت صالحہ پر ہوگا اور اس سے رضاء الٰہی کے خلاف کوئی کام آئندہ بھی نہ ہوگا۔

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الرَّاشِدُوْنَ ۞﴾ (پارہ:۲۶ سورۃ الحجرات)

اس آیت میں بھی بلااستثناء تمام صحابہ کرام کے لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کی محبت اور کفر و فسق اور گناہوں کی نفرت ڈال دی۔

اس جگہ فضائل صحابہؓ کی سب آیات کا استیعاب مقصود نہیں، ان کے مقام و مرتبہ کو ثابت کرنے کے لئے یہ چند آیات مذکورہ بھی کافی ہیں، ان سے ان کا مقبول عنداللہ ہونا اور جنت کی ابدی نعمتوں سے ان کا سرفراز فرمایا جانا ثابت ہوگیا۔

یہ ارشادات اس ذات حق کے ہیں جو سب کو پیدا کرنے والا ہے اور پیدائش سے پہلے ہر انسان کے ایک ایک سانس ایک ایک قدم سے اور اچھے برے عمل سے خوب واقف ہے جو بھی وقوع میں آنے والے ہیں اس نے صحابہ کرامؓ کے بارے میں جو اپنی رضاء کامل اور جنت کی بشارت دی ہے ان سب واقعات و معاملات کو جانتے ہوئے دی ہے جو ان میں سے ہر ایک کو عہد رسالت میں یا اس کے بعد پیش آنے والے تھے اسی لئے علماء حق کے قلوب میں حضرات صحابہؓ کی عظمت و وقعت اور ان کی عزت و محبت پورے طور پر موجود ہے۔

حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ کا ارشاد گرامی

منجملہ علماء حق و اکابر محققین کے ہمارے حضرت (حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ) فرماتے ہیں کہ صحابہ کا (سب سے بڑا) کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان آنکھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آراء کی زیارت کی تھی یہ وہ کمال ہے کہ اس میں ان کی کوئی برابری نہیں کرسکتا نہ عمر بن عبدالعزیز جو کہ اپنے زمانہ کے مجدد اور قطب وقت تھے اور بوجہ عدل کامل و اتباع سنت کے خامس الخلفاء الراشدین شمار کئے جاتے ہیں نہ اویس قرنی جو افضل التابعین ہیں جن کے بارے میں علماء امت کا خیال یہ ہے کہ وہ گو صحابی نہیں مگر ثواب میں صحابہ کے

قریب قریب ہیں مگر پھر بھی ان جیسے نہیں کیوں کہ حضرت اویس قرنی کے پاس وہ دو آنکھیں کہاں تھیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرمبارک کی زیارت کی ہو اگرچہ ان کے فضائل بے شمار ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و دیگر صحابہ کو ارشاد فرمایا تھا کہ ایک شخص یمن کا رہنے والا اویس قرنی نام کا آئے گا اگر ان سے ملو تو میرا سلام پہنچا دیجیو، اور ان سے اپنے لئے دعاء کرائیو۔ اللہ اکبر! اتنے بڑے درجہ کے شخص ہیں مگر صحابہ کے برابر پھر بھی نہیں بس افضل التابعین ہیں۔

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے (انہیں دو شخصوں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت اویس قرنی کا ذکر کر کے) کسی نے سوال کیا تھا حضرت معاویہؓ (ان دونوں کے مقابلہ میں) کیسے ہیں؟ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اس سوال سے بہت جوش آیا، فرمایا کہ اگر امیر معاویہؓ گھوڑے پر سوار ہوں اور اڑ مار کر اللہ کے راستہ میں اس کو دوڑائیں تو جو خاک معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں رینٹ سے ملی ہوئی ہوگی عمر بن عبدالعزیز اور اویس قرنی جیسے ہزاروں سے وہ خاک بھی افضل ہے۔ (اس کے بعد حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں) واقعی حضورؐ کی زیارت نے صحابہ کو وہ رتبہ بخشا ہے کہ بڑے سے بڑے ولی بھی حتی کہ امام مہدی بھی ایک ادنی صحابی کے برابر نہیں ہوسکتے اور یہ حق تعالیٰ شانہ کا بہت ہی بڑا فضل و احسان امت محمدیہ کے حال پر ہے کہ ہمارے "سلف" خلف پر صحابہ کی فضیلت کو پوری طرح منکشف کردیا کہ سب نے اس پر اجماع و اتفاق کرلیا کہ الصحابة کلھم عدول و افضل الخلائق بعد الانبیاء اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی صحابہ سب کے سب معتبر اور ثقہ ہیں ان میں کوئی شخص غیر معتبر نہیں اور تمام مخلوق میں بعد انبیاء علیہم السلام کے سب سے زیادہ افضل صحابہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

اور صحابہ کی نسبت حضرات سلف صالحین کا یہ اجماع محض حسن اعتقاد ہی کی بناء پر نہیں بلکہ خود ان کے احوال و اعمال سے ان کی دیانت اور راست بازی و پرہیز

گاری ایسی کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ موافق تو موافق مخالف تک اس کا اقرار کئے ہوئے ہیں جس پر تاریخ گواہ ہے جس کے بعد اس قول میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ الصحابة کلهم عدول۔

حضرات صحابہ کی اس فضیلت کے انکشاف سے صرف یہی نہیں کہ دین کی حفاظت ہوگئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی فضیلت کے اقرار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھ گئی "یہ قاعدہ ہے" کہ جس قدر صحابہ کے ساتھ اعتقاد بڑھتا ہے اسی قدر حضور کے ساتھ محبت بڑھتی ہے اور جس قدر کسی کو بے اعتقادی ہوتی ہے اسی قدر حضور کے ساتھ محبت میں کمی ہوجاتی ہے۔

"الغرض" صحابہ میں ایک ایسی بات ہے جو کسی امتی کو نصیب نہیں وہ یہ کہ انہوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا اور حضور کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سپرد کردیا پھر حضور کی برکت سے وہ وہاں پہنچے جہاں ہزار برس کے مجاہدوں سے بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ (وعظ الجلآء للابتلآء)

نصوص قرآنیہ و حدیثیہ وارشادات اکابر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرات صحابہ کا مقام و مرتبہ نہایت بلند و باعظمت ہے اس لئے ان کی تنقیص یا ان پر تنقید کا کسی کو کوئی حق نہیں، اور ان کی بُرائی تقریر و تحریر میں ہرگز روا نہیں ہوسکتی بلکہ سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔

نیز ان کی وقعت و عظمت اور ان سے محبت رکھنا ایمان و اسلام کی مضبوطی و حفاظت کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے عامۃً ان کی کسی خطاء اجتہادی کا تذکرہ بھی درست نہیں ان کے ادب و احترام کے بھی خلاف ہے اور اہل اسلام کے لئے بھی مضر ہے۔

ایک ضروری تنبیہ

گو خطاء اجتہادی شرعاً قبیح نہیں ہے مگر عوام لفظ "اجتہادی خطاء" کے باریک

فرق کو نہیں سمجھتے بلکہ وہ خطاء اور اجتہادی خطاء دونوں کو ایک جانتے ہیں اس لئے اس بحث کو منظر عام پر لانے سے عوام میں صحابہ کرام کی شان میں جرأت و بیباکی پیدا ہوجاتی ہے جو بذات خود ایک زبردست مفسدہ ہے جس سے حذر و اجتناب لازم ہے کیونکہ اس طرح صحابہ پر تنقید و تبصرہ بلکہ تنقیص و تذلیل کا دروازہ کھل جاتا ہے لہٰذا اہل علم کو اس بحث سے جو عوام کے عقائد کو برباد کرنے والی ہے سخت احتیاط کرنا چاہئے ورنہ اہل علم اس گمراہی کا سبب ہوں گے۔

حدیث شریف میں وارد ہے:

﴿من سن سنة سيئة فله وزرها ووزر من عمل بها الٰی یوم القیامة﴾

جس کا حاصل یہ ہے کہ غلط طریق اختیار کرنے سے جو لوگ اس غلطی میں پڑیں گے سب کا ذمہ دار، سب جتنا گنہ گار اول شخص ہوگا۔

پس صحابہ کی عظمت یہ دین متین کی حفاظت کی پہلی اینٹ ہے گر انہی کی عظمت میں کجی پیدا ہوگئی تو پھر دین کی خیر نہیں جیسا کہ "ایسی جماعت" کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دین میں اپنی رائے سے تغیر پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اللھم احفظنا منہ۔

امت کے بگاڑ کا علاج

دراصل یہ امت کے بگاڑ کی حالت ہے اور اس کا اصلی سبب اپنے اسلاف و اکابر کے طریق اور اپنے امیر کی اطاعت سے نکل جانا ہے۔ لہٰذا اس صفت اصلیہ اطاعت امیر کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے اکابر کی کامیابی کا راز یہی سمع و طاعۃ تھا۔ آج بھی ہم اسلاف و اکابر اور اطاعت امیر دل سوزی و خلوص سے کرنے لگ جائیں تو پھر کامیابی ہمارے قدم چوم

سکتی ہے۔

یہاں پہنچ کر شاید کسی کو یہ خلجان ہو کہ دلائل و براہین کے اعتبار سے تو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ امور غیر منصوصہ متعلقہ بالا نتظام میں امیرو مہتمم بعد المشورۃ نفاذ میں مختار ہے اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اختلاف کی صورت میں اسی کی رائے کو ترجیح ہو لیکن بعض وقت حالات اس نوع کے ہوجاتے ہیں کہ آپس میں رفع نزاع کی صورت نہیں بنتی یا تو اس وجہ سے کہ مہتمم بوجہ ہم عصر ہونے کے بعض کے نزدیک قابل ترجیح نہیں ہوتا یا بعض حالات میں مہتمم کو مثل فریق سمجھ لیا جاتا ہے گویہ رائے دلائل کی روشنی میں مجوج ہے جیسا کہ مفصلاً بیان کیا گیا لیکن چونکہ مہتمم کے پاس قوت قہریہ نہیں ہے اس لئے رفع نزاع کی کیا صورت ہوگی؟

حل اس کا یہ ہے کہ ایسی صورت میں مدرسہ کا ایک ایسا سرپرست ہو جو سب کے نزدیک مسلم ہستی ہو، اس کی عظمت قلوب میں ہو۔ وہ علم و عمل کا جامع ہو، اس کے سامنے حالات رکھے جائیں وہ جو فیصلہ فرمادے اس پر سب متفق ہوجائیں یہ رفع اختلاف کی بہترین بے ضرر صورت ہے۔ سلف میں اس کی مسلم نظیر حضرت مولانا گنگوہیؒ ہیں کہ جب ان کے زمانہ سرپرستی میں اہل مدارس میں اختلاف ہوتا تھا تو آپ کی طرف رجوع کرکے اختلاف کو ختم کردیا جاتا تھا جس پر یہ واقعہ شاہد عدل ہے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے زمانہ سرپرستی میں ایک رئیس شیخ زادے نے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا ممبر بننا چاہا چونکہ وہ صاحب شرائط ممبری پر پورے نہ اترتے تھے اس لئے مولانا گنگوہیؒ نے ان کی ممبری سے صاف انکار فرمادیا، چونکہ وہ صاحب ریاست و منصب والے تھے اس لئے اس پر بہت شورش برپا ہوئی۔ حتیٰ کہ مدرسہ بند ہونے کے قریب ہوگیا اس پر بعض اہل شوریٰ اور مہتمم مدرسہ کی رائے یہی ہوگئی کہ ان رئیس صاحب کو دفع فتنہ کے لئے ممبر بنالیا جائے اسی میں مصلحت ہے حتیٰ کہ حضرت والا مولانا تھانویؒ نے بھی حضرت مولانا سے عرض کیا کہ حضرت اس وقت شورش بہت ہورہی ہے۔ قریب ہے کہ مدرسہ کو تالا لگ جائے ایسی

صورت میں رفع فتنہ و شر کے لئے اگر ان کو ممبر بنالیا جائے تو کیا حرج ہے، اکثریت تو حضرت کے خدام ہی کی ہوگی، ان ایک صاحب کا کیا اٹھے گا۔

اس پر حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک دینی معاملہ ہے اس میں نااہل کو ممبر بنانا جائز نہیں، میں اس ناجائز کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔ رہا مدرسہ تو اگر بند ہوگا تو اس کا وبال ہم پر نہیں پڑے گا بلکہ ان لوگوں پر پڑے گا جو شورش برپا کررہے ہیں پھر ہمیں اس کی کیا فکر؟ اور اگر نااہل کو ممبر بنالیتے ہیں تو اس کی ہم سے پوچھ ہوگی ہم کو اس کی فکر چاہئے الغرض حضرت مولانا کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ اس مضبوطی کی برکت سے کچھ دن بعد وہ فتنہ رفع ہوگیا۔

تو دیکھئے اس صورت اختلاف میں رفع اختلاف اس طرح کیا گیا کہ سرپرست کی رائے کو فیصل قرار دیا گیا اور عقل کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ اختلاف کا کوئی منتہیٰ ضرور ہونا چاہئے ورنہ اختلاف ختم ہی نہ ہوگا اور امور ضروریہ معطل رہ جائیں گے۔ عدالت مجازی میں اس کی نظیر مراحم خسروانہ ہے کہ ماتحت عدالتوں نے کسی شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ کردیا مثلاً کسی کے قتل کا اس نے صدر مملکت کے یہاں درخواست دے دی اور صدر نے اس کو منظور کرلیا اور قاتل کو رہا کردیا گیا تو تمام عدالت ہائے ماتحت، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ سب اس کو تسلیم کرلیتے ہیں کوئی ناگواری کا اظہار نہیں کرتا، اسی طرح سرپرست کی رائے کے بعد اس پر تمام اہل اختلاف کو متفق ہوجانا چاہئے ورنہ تو سرپرست بے کار ہوا۔ اسی وجہ سے حضرت والا (مولانا تھانویؒ) نے دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی سے استعفاء دے دیا تھا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت (مولانا تھانویؒ) کے زمانہ سرپرستی میں قاعدہ یہ تھا کہ اہل شوریٰ جو تجاویز پاس کرتے تھے وہ سرپرست ہونے کی حیثیت سے حضرت والا کے پاس تھانہ بھون آتی تھیں حضرت ان پر نظر فرماتے، کچھ حذف و اثبات کے بعد واپس فرمادیتے تھے لیکن اہل شوریٰ حضرت والا کی ترمیم کو نظرانداز فرماکر فیصلہ فرمادیتے تھے جب چند مرتبہ ایسا ہوا تو حضرت والا نے سرپرستی سے استعفاء بھیج دیا

اور فرمایا کہ سرپرستی کہاں ہے سر پڑے کی بات ہے۔ جب حضرت کا استعفاء دارالعلوم پہنچا تو ہلچل مچ گئی اور مہتمم صاحب مع چند اہل شوریٰ کے تشریف لائے، گفتگو ہوئی حضرت نے فرمایا کہ جب میری ترمیمات کو قبول نہیں کیا جاتا تو سرپرستی سے کیا فائدہ ہے اس لئے میں نے استعفاء دے دیا۔ اس پر ایک ممبر صاحب نے فرمایا کہ جب سرپرست کی رائے ہی اصل ہوئی تو شوریٰ بے کار ہے۔

حضرت والا نے جواباً ارشاد فرمایا کہ شوریٰ بے کار نہیں، بات یہ ہے کہ ایک شخص کی رائے تمام پہلوؤں کو حاوی نہیں ہوتی، شوریٰ کا فائدہ یہ ہے کہ معاملہ کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں پھر اہل شوریٰ میں سے کسی کے ذہن میں کوئی مفید صورت آجاتی ہے سرپرست اس کو قبول کرلیتا ہے یہ فائدہ ہے شوریٰ کا تو شوریٰ باکار ہوئی بے کار نہ ہوئی۔

تو دیکھئے سرپرست کی بات کو منتہیٰ نہ ماننے سے حضرت والا نے استعفاء دے دیا۔ معلوم ہوا کہ آخری فیصلہ کے لئے سرپرست کی رائے کو منتہیٰ ماننا ضروری ہے۔ سرپرست کی رائے مثل مرکز ہے اور قاعدہ ہے کہ رجوع مرکز کی طرف ہوتا ہے اسی لئے مکی زندگی میں باوجود صحابہ کرامؓ کے چاہنے اور خواہش کرنے کے جہاد فرض نہیں کیا گیا کیونکہ اپنا کوئی ایسا مرکز نہ تھا جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع ہوسکے۔ جب مدینہ شریف میں مرکز قائم ہوگیا تو دوسرے ہی سال بدر میں تمام سامان جنگ سے لیس ہر طرح سے مضبوط ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ صرف تین سو تیرہ کو اور وہ بھی گویا نہتے جہاد کرنے کا حکم فرمادیا کیونکہ فرضیت جہاد کی بڑی شرط مرکز ہے جو کہ وہ جہاد کے لئے علت ہے وہ قائم ہوچکا تھا، یہ بات ضمناً مرکز کے ذکر پر آگئی تھی، پس سرپرست کو مثل مرکز سمجھنا چاہئے اور اس کے فیصلہ کو آخری فیصلہ جان کر اختلاف بالکل ختم کردینا چاہئے۔

یہ تمام بحث ضمناً آگئی تھی جو ضروری اور حالات حاضرہ کے اعتبار سے مفید ہونے کی وجہ سے یہاں ذکر کردی گئی۔ اصل مضمون شوریٰ کے بارے میں تھا کہ

نفاذ میں امیر مختار ہے یا شوریٰ کا ماتحت ہے سو بحمد اللہ تعالیٰ متعدد آیات و احادیث اور ان کی تفسیر و شروح سے یہ بات ثابت، مثبت ہوگئی کہ امیر نفاذ میں اصل مختار ہے۔

اب حسب وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور خلفاء راشدین کا تعامل باب مشاورت میں پیش کیا جاتا ہے جس کا اتباع بموجب حدیث علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المھدیین (مشکوۃ شریف صفحہ ۳۰) ہمارے لئے ضروری ہے

اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درباب مشاورت

پہلا واقعہ صلح حدیبیہ: آیت کریمہ وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کی شرح میں پہلے تفصیلاً یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ مشیروں کا کام صرف مشورہ دینا ہے، امام کو اختیار ہے کہ ان میں سے کسی کی رائے پر عزم کرکے نفاذ کرے یا اپنی رائے پر عزم کرکے نفاذ کرے، اس کی سب سے بڑی نظیر صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے جس کو مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ ہم مکّہ میں امن و اماں کے ساتھ گئے اور عمرہ کرکے حلق و قصر کیا، آپ نے یہ خواب صحابہ سے بیان فرمایا، اگرچہ آپ نے مدت کی تعیین نہیں فرمائی تھی مگر شدت اشتیاق سے اکثر صحابہ کا خیال اس طرف گیا کہ امسال عمرہ میتسر ہوگا اور پھر آپ کا قصد بھی عمرہ کا ہوگیا۔ سو آپ بقصد عمرہ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ مکّہ چلے اور ہدی (قربانی کے جانور) بھی آپ کے ساتھ تھے، جب یہ خبر مکّہ پہنچی تو قریش نے بہت سا مجمع کیا اور اتفاق کرلیا کہ آپ کو مکّہ نہ آنے دیں گے، آپ نے حدیبیہ ہی میں قیام فرمایا اور صحابہ سے بیعت لی جو بیعت رضوان کہلاتی ہے، پھر مکّہ کے بعض رؤسا بغرض صلح آپ کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور سہیل نے قریش کا پیغام آپ کو پہنچایا کہ اس سال واپس ہوجائیں اور اگلے سال عمرہ کے لئے آجائیں اور تین روز مکّہ میں قیام کریں، صحابہ کرامؓ عموماً اس پر راضی نہ تھے کہ اس وقت احرام بغیر عمرہ کے کھولدیں۔ آخر طویل گفتگو کے بعد صلح نامہ لکھنا قرار پایا، آپ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور فرمایا لکھو بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم سہیل نے کہا رحمٰن و رحیم ہمارے محاورات نہیں ہیں ہاں پرانا کلمہ باسمک اللّٰھم لکھوایئے، آپ نے اس کو مان لیا، پھر آپ نے حضرت علیؓ سے، فرمایا لکھو:

﴿ھٰذا ماقاضٰی علیہ محمد رسول اللّٰہ فقالوا لانقربھا فلو نعلم انک رسول اللّٰہ مامنعناک لکن انک محمد بن عبداللّٰہ قال انا رسول اللّٰہ وانا محمد بن عبداللّٰہ قال لعلی امح رسول اللّٰہ قال لا واللّٰہ ما امحوک ابدا﴾

(بخاری شریف جلد ا صفحہ ۳۷۲)

”یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی ہے، قریش نے کہا ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول جانتے تو آپ کو نہ روکتے ہاں آپ محمد بن عبداللہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں رسول اللہ بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی ہوں، پھر آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا رسول اللہ کو مٹادو۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ واللہ میں کبھی نہ مٹاؤں گا۔“

معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۶۱ میں ہے کہ حاضرین میں سے حضرت اسیدؓ بن حضیر اور سعدؓ بن عبادہ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اس کو نہ مٹائیں اور بجز رسول اللہ کے اور کچھ نہ لکھیں اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ان کے اور ہمارے درمیان تلوار

فیصلہ کرے گی اور کچھ آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلحنامہ کا کاغذ اپنے دست مبارک میں لے لیا اور باوجود اس کے کہ آپ امّی تھے بطور معجزہ خود اپنے قلم مبارک سے لکھ دیا۔

انہی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مسلمان مشرکین کے پاس چلا جائے گا وہ واپس نہ کریں اور مشرکین میں سے جو مسلمان ہوکر مدینہ آجائے گا مسلمان اس کو واپس کردیں گے۔ اس پر بھی مسلمان بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:

﴿سبحان اللّٰہ کیف یرد الی المشرکین من جاء مسلماً﴾ (نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۲۹)

یعنی مسلمانوں نے کہا کہ جو مسلمان ہوکر آجائے گا اس کو مشرکین کی طرف کیسے لوٹایا جاسکتا ہے۔ لیکن انجام کار باوجود مسلمانوں کی ناراضگی کے صلحنامہ مکمل ہوگیا جس کو منتقی الاخبار میں اس طرح نقل فرمایا ہے:

﴿فلما فرغ من قضیة الکتاب قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا صحابہ تولوا فانحرو اثم احلقوا فواللّٰہ ما قام منھم احد حتی قال ذلک ثلٰث مرات فلما لم یقم منھم احد دخل علی ام سلمة فذکر لھا مالقی من الناس فقالت ام سلمة یا نبی اللّٰہ اتحب ذلک اخرج ولا تکلم احدا منھم کلمة حتی تنحربدنک وتد عوحا لقا فیحلقک فخرج فلم یکلم احدا منھم حتی فعل ذلک نحربدنہ و دعا حالقه فلما رؤا ذٰلک قاموا فنحروا وجعل بعضھم یحلق بعضاً حتی کاد بعضھم یقتل بعضا غما﴾

(منتقی الاخبار جلد ۸ صفحہ ۳۰)

”سو جب آپ صلح نامہ سے فارغ ہوگئے تو آپ نے صحابہ سے

فرمایا اٹھو اور قربانی کرو پھر سر منڈاؤ، سو قسم خدا کی ان میں سے کوئی نہیں اٹھا یہاں تک کہ آپ نے یہ تین مرتبہ فرمایا سو جب ان میں سے کوئی نہیں اٹھا تو آپ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا اس کو ذکر کیا تو حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا اے اللہ کے نبی! کیا آپ یہ چاہتے ہیں تو آپ باہر تشریف لے جائیں کسی سے کوئی کلام نہ فرمائیں یہاں تک کہ آپ اپنی قربانی فرمادیں اور سر منڈانے والے کو بلائیں تاکہ وہ آپ کا سر مونڈدے سو آپ باہر تشریف لائے اور کسی سے کوئی کلام نہیں کیا، یہاں تک کہ یہ کیا کہ اپنی قربانی ذبح کی اور حالق کو بلایا اور اس نے آپ کا حلق کیا۔ سو جب صحابۂ کرام نے یہ دیکھا تو اٹھے پھر قربانی کی اور ایک دوسرے کا حلق کرنا شروع کیا غم کے سبب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کررہا ہے۔"

اس تفصیلی واقعہ سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے۔

امر اول: شرائط صلح نامہ اور احرام کھولنے میں جمہور صحابہؓ نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا، لیکن آپ نے صلح کو مناسب سمجھ کر ان میں سے کسی کی رائے کو اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی رائے پر عزم کرکے اسی کو نافذ فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا اختیار امیر ہی کو ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت بلقیس نے جب اہل دربار سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پاکر مشورہ طلب کیا تھا:

﴿قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ ۚ مَاكُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝﴾ (پارہ:۱۹ سورۃ النمل)

"کہ اے درباریو! میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو کیونکہ

میں کسی معاملہ میں قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم نہ حاضر ہو۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع امر یعنی نفاذ وہ امیر ہی کا حق ہے البتہ مشورہ اہل دربار سے لیا جاتا ہے اہل دربار نے جواب دیا:

﴿نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝﴾ (پارہ: ۱۹ سورۃ النمل)

"کہ ہم اہل قوت ہیں اور سخت لڑنے والے ہیں لیکن معاملہ کا اختیار تمہیں ہے پس تم غور کرلو کہ کیا حکم دینا ہے۔"

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اصل اختیار امیر کو ہے چنانچہ اس کے تحت میں تفسیر کبیر میں ہے:

﴿و ذٰلک اظهار الطاعة لها﴾ (تفسیر کبیر جلد ۲۳ صفحہ ۱۹۵)

"اور اس میں بلقیس کے لئے اطاعت کا اظہار ہے۔"

امر دوم: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رائے پر حرف بحرف عمل فرمایا پس اقلیت کا مشورہ اکثریت کے مقابلہ میں امیر یا کوئی بھی مستشیر قبول کر سکتا ہے۔ نیز یہ کہ عورتوں کا مشورہ بھی قبول کیا جاسکتا ہے اس میں دلیل ہے کہ ہر عورت ایسی نہیں ہوتی کہ اس کی رائے کی مخالفت کی جائے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے:

﴿فيه دليل علىٰ فضل ام سلمة و وفور عقلها﴾

(نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۴۰)

کہ اس میں حضرت ام سلمہؓ کے فضل اور بھرپور عقل کی دلیل ہے جیسا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ ایسی فقیہہ تھیں کہ بڑے بڑے صحابہ ان سے مشکل مسائل

حل کرتے تھے۔

الغرض صلح حدیبیہ کے تفصیلی واقعہ سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ امیر و مستشیر اہل شوریٰ کا پابند نہیں ہے بلکہ نفاذ میں مختار ہے۔

دوسرا واقعہ: حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے کہ یہ باندی تھیں اور حضرت مغیث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں جو غلام تھے حضرت بریرہؓ کے آقا نے انہیں آزاد کردیا آزاد ہوجانے کے بعد زوجہ کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے چنانچہ حضرت بریرہؓ نے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ کردیا اور حضرت مغیثؓ سے علیحدگی اختیار کرلی، حضرت مغیثؓ کو چونکہ ان سے محبت تھی اس لئے حضرت بریرہؓ کی علیحدگی سے بہت پریشان ہوئے، گلی، کوچہ میں ان کی جدائی کے سبب روتے پھرتے تھے، یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت مغیثؓ پر رحم آیا اور حضرت بریرہؓ کو مشورہ دیا کہ حضرت مغیثؓ سے دوبارہ نکاح کرلیں۔ حضرت بریرہؓ نے عرض کیا **أتامرني** (کیا آپ حکم فرماتے ہیں) آپ نے فرمایا **انا اشفع** (میں سفارش کرتا ہوں) یعنی حکم نہیں مشورہ ہے حضرت بریرہؓ نے عرض کیا **لا حاجة لي فيه** (مشکوٰۃ صفحہ ۲۷۶) (مجھے ان کی ضرورت نہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو انہیں مجبور کیا نہ ناگواری کا اظہار کیا۔

اس واقعہ سے جہاں مشورہ کی حقیقت "عدم جبر" معلوم ہوگئی وہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کسی کا مشورہ نہ قبول کیا جائے تو اس کو مستشیر سے منقبض نہیں ہونا چاہئے۔

فائدہ: حضرت بریرہؓ نے آپ سے یہ استفسار **أتامرني** (کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں) اس لئے کیا کہ اگر آپ کسی کو صریح حکم دیں خواہ وہ دنیوی معاملہ میں ہی ہو تو اطاعت واجب ہوجاتی ہے حتمی فیصلہ اور حکم کی شان بہت اونچی ہے اس کی بہر حال اطاعت ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾

(پارہ: ۲۲ سورۃ الاحزاب)

"کہ کسی مسلمان مرد یا عورت کو کچھ گنجائش نہیں رہتی جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حکم دے دیں۔"

غرضیکہ مشورہ کا معاملہ حتمی فیصلہ سے جدا ہے، اس حتمی فیصلہ کو فاذا عزمت میں عزم سے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ آپ کے عزم کر لینے کے بعد پھر کسی کو مخالفت کی گنجائش نہیں رہتی پھر تو بس سمع وطاعت ہی ضروری ہے۔

واقعہ سوم غزوہ احزاب: غزوہ احزاب میں تمام قبائل عرب اور یہودیوں کی اتحادی طاقت نے مل کر مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا تھا کفار کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی خبر ملی تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، اس مجلس میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمارے بلاد فارس کے بادشاہ ایسی حالت میں دشمن کا حملہ روکنے کے لئے خندق کھود کر ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور خندق کھودنے کا حکم دے دیا اور خود بھی بنفس نفیس اس کام میں شریک ہو گئے۔

اسی غزوہ میں جب محاصرہ طویل ہو گیا اور مخالفین کی کثرت سے مسلمان مضطر ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف کو بلوایا، یہ دونوں غطفان کے سردار تھے، آپ نے ان سے مدینہ کی ثلث پیداوار پر مصالحت کی بات شروع کی۔ حضرت سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ کو معلوم ہوا تو مصالحت نہ کرنے کا مشورہ دیا، اس کو آپ نے قبول کر لیا۔ چنانچہ آیت کریمہ وشاورھم فی الامر کے تحت احکام القرآن میں ہے:

﴿اشار علیه السعدان (ای سعد بن معاذ و سعد بن عبادة) یوم الخندق بترک مصالحة غطفان علی بعض اثمار المدینة فقبل منهم﴾ (احکام القرآن تحت الآیۃ)

"یعنی سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ نے غطفان سے مدینہ کی کچھ پیداوار پر مصالحت نہ کرنے کا مشورہ دیا اسے آپ نے قبول کرلیا۔"

ان دونوں واقعوں سے دو باتیں معلوم ہوئی ایک یہ کہ اقلیت کے مشورہ کو بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔ دوسری یہ کہ ممبران شوریٰ کا متعیّن ہونا ضروری نہیں، کیف ما اتفق امیر جس سے چاہے مشورہ کرے یا جو چاہے مشورہ دے دے امیر کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔

احکام القرآن میں ہے:

﴿قد اشار الخباب بن المنذر یوم بدر علی النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم بالنزول علی الماء فقبل منه﴾

(احکام القرآن جلد صفحہ ۴۰)

"یعنی حضرت خبابؓ بن المنذر نے (بلند اور ریتیلی زمین پر ایک کنواں تھا اس میں پانی بہت لطیف تھا، وہاں اترنے کا آپ کو مشورہ دیا (کیونکہ حضرت خباب وہاں کے حالات سے خوب واقف تھے) آپ نے قبول فرمالیا۔"

چوتھا واقعہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قافلۂ ابوسفیان کے تعاقب کے بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ قافلۂ مذکورہ کا تعاقب کیا جائے یا یہیں سے واپسی کی جائے تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشورہ دینے پر آپ نے اعراض کیا، جب سعدؓ بن عبادہ نے مشورہ دیا تو آپ نے قبول فرما لیا اور قافلہ کا

تعاقب کیا۔ چنانچہ حیاۃ الصحابہ عربی میں بروایت احمد اس واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿عن انسؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ وقال سعد بن عبادۃ ایانا یرید رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحار لا خضنا ھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الٰی برک الغماد لفعلنا فندب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الناس﴾

(حیاۃ الصحابہ جلد ۱ صفحہ ۳۹۸)

"یعنی حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا پتہ چلا تو صحابہ سے مشورہ کیا (کہ اس پر حملہ کیا جائے یا نہیں) حضرت ابوبکرؓ نے کچھ کہنا چاہا آپ نے منہ پھیر لیا پھر حضرت عمرؓ نے کچھ کہنا چاہا آپ نے منہ پھیر لیا پھر حضرت سعدؓ بن عبادہ انصاری نے فرمایا کہ آپؐ انصار سے جواب لینا چاہتے ہیں۔ تو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر آپ ہم لوگوں کو حکم دیں کہ ہم اپنی سواریاں سمندر میں گھسادیں تو ہم ان کو سمندر میں گھسادیں گے اور اگر آپ ہم کو حکم دیں کہ ہم اپنی اونٹنیاں برک غماد تک لے جانے کے لئے ان کے کلیجے چھلنی کردیں تو ہم ضرور ایسا ہی کریں گے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چلنے کے لئے جمع کیا۔"

اس واقعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ مشورہ کے لئے تعیین اشخاص ضروری نہیں ہے بلکہ متعلقین معاملہ سے مشورہ لیا جاتا ہے جیسا کہ یہاں آپؐ نے انصار کی رائے معلوم کی کیونکہ ان سے ہی معاملہ کا تعیّن تھا، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے افضل الامۃ کے مشورہ سے بھی اعراض کیا۔ نیز صحابہ کرامؓ کا جذبۂ اطاعت و فرمانبرداری بھی خوب ظاہر ہے، کہ اعراض پر ذرہ برابر گرانی نہیں ہوئی۔

پانچواں واقعہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر جس میں کبار صحابہ مہاجرین و انصار موجود تھے، جنگ کرنے کے لئے روم کی طرف بھیجنے کا حکم فرمایا، بخاری شریف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے:

﴿عن عبداللّٰہ بن عمر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعث بعثا و امر علیھم اسامۃ بن زید فطعن الناس فی امارتہ فقام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال ان تطعنوا فی امارتہ فقد کنتم تطعنون فی امارۃ ابیہ من قبل وایم اللّٰہ ان کان لخلیقا للامارۃ و ان کان لمن احب الناس الی و ھذالمن احب الناس الی بعدہ﴾

(بخاری شریف جلد۲ صفحہ۶۴۱)

”عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر تیار کیا اور اس پر اسامہ بن زید کو امیر بنایا تو لوگوں نے ان کی امارت پر طعن کیا سو آپ ممبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا اگر تم ان کی امارت پر طعن کرتے ہو تو تم تو ان کے باپ (زید) کی امارت پر طعن کرتے تھے حالانکہ خدا کی قسم وہ امارت کے لائق تھے اور وہ میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ

محبوب تھے اور یہ (اسامہ) ان کے بعد میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں۔"

تنفیذ امر میں طعن و تشنیع کی پروانہ کرے

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ عزم کے بعد تنفیذ یہ امام کا حق ہے، نیز یہ کہ امیر جس بات کا عزم کرے اس کو اللہ پر بھروسہ کرکے کر ڈالے اور لوگوں کی طعن و تشنیع کی ہرگز پروانہ کرے کیونکہ مشورہ کا درجہ صرف ایک تدبیر کا ہے اور بعض تدبیر کبھی مفید ہوتی ہے کبھی نہیں اس لئے اس کا اختیار کرنا لازم نہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عن انسؓ ان رجلا قال للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اوصنی فقال خذالامر بالتدبیر فان رأیت فی عاقبتہ خیراً فامضہ وان خفت غیًّا فامسک﴾

(مشکوۃ باب الحذر صفحہ ۴۳۰)

"حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے وصیت فرمایئے، آپ نے فرمایا کام کو تدبیر سے کرو سو اگر اس کے انجام میں خیر پاؤ تو کر ڈالو اور اگر بھٹکنے کا خوف کرو تو رک جاؤ۔ برخلاف توکل کے کہ وہ ہمیشہ مفید ہی ہوتا ہے اور ہر تدبیر سے فوق وبلند ہے، نیز متوکل علی اللہ کی نصرت غیب سے ہوتی ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۝﴾

(پارہ:۲۸ سورۃ الطلاق)

"یعنی اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کو کافی ہے۔"

مفضول کو فاضل پر امیر مقرر کیا جاسکتا ہے

نیز حدیث اسامہؓ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹے کو بڑوں پر اور مفضول کو فاضل پر امیر بنانا جائز ہے بشرطیکہ اس میں اہلیت ہو، چنانچہ حدیث مذکور کے تحت مُلّا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

﴿قال بعض المحققين فيه جواز امارة المولٰى و تولية الصغار على الكبار و المفضول على الفاضل﴾

(مرقات جلد ۱۱ صفحہ ۳۸۴ باب مناقب اہل البیت)

"یعنی بعض محققین نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں غلام کی امارت اور چھوٹوں کی بڑوں پر اور مفضول کی فاضل پر تولیت و امارت کا جواز ہے۔"

جب حضرت اسامہؓ کو امیر لشکر بنایا تو ان کی عمر انیس سال تقریباً تھی۔ نیز یہ لشکر اسامہؓ دراصل حضرت زیدؓ بن حارثہ کے انتقال کے بعد ان کے قائم مقام حضرت اسامہؓ کو بنا کر تیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ فتح الباری میں ہے کہ:

﴿دعا اسامة فقال سر الى موضع مقتل ابيك﴾

(فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۵)

"یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہؓ کو بلا کر فرمایا کہ اپنے والد (حضرت زیدؓ) کے مقتل کی طرف جاؤ۔"

بشرط صلاحیت عزیز و معتمد کو منصب دیا جاسکتا ہے

اس میں اس بات کے جواز پر دلیل ہے کہ اپنے عزیز و قریب و معتمد کو کوئی

منصب دیا جاسکتا ہے کیونکہ اپنے عزیز معتمد کے رکھنے سے وہ اس کے لئے مثل قوت بازو کے ہوتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو وزیر بنانے کی درخواست میں یہی وجہ بیان فرمائی:

﴿وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ۝ ھٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ ۝﴾ (پارہ: ۱۶ سورہ طٰہٰ)

"یعنی میرے اہل میں سے میرا ایک وزیر بنادیجئے یعنی میرے بھائی ہارون کو ان کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کردیجئے۔"

اس آیت میں اپنے اہل میں سے اپنا معاون مانگنے کی درخواست ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مستحسن امر ہے۔

اور راز اس میں یہ ہے کہ اپنے اہل کے تعاون و مدد کرنے میں ایک طبعی الفت لگاؤ ہوتا ہے، وہ اپنے اہل کے بقیہ کام کو بڑی خوش اسلوبی، دلسوزی، حوصلہ مندی سے بڑھا سکتا ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا:

﴿قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی ۝﴾ (پارہ: ۱۶ سورہ طٰہٰ)

"اے موسیٰ تمہاری درخواست قبول کی گئی۔"

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات بالصراحت واضح ہوگئی کہ امیر کو اپنی اعانت کے لئے اپنے کسی اہل کی درخواست کرنا یا خود متعین کرنا خلاف اولیٰ نہیں بلکہ عین قرین مصلحت و حکمت ہے اور حسن انتظام کے نقطۂ نظر سے احسن طریق میں سے ہے کیونکہ الولد سرلابیہ بیٹا باپ کا بھیدی ہوتا ہے اور صاحب البیت ادریٰ بمافی بیتہٖ کی رو سے گھر والا گھر کی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے لہٰذا ایسی صورت کو اقرباء نوازی اور کنبہ پروری سمجھنا اور اعتراض کرنا کم علمی کی دلیل ہے چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی جو لاولد تھے اپنا وارث بنانے کے لئے ولد کی درخواست کی جیسا کہ اس آیت شریفہ میں ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝﴾ (پارہ: ۳ سورۃ آل عمران)

"اے میرے رب مجھے پاک اولاد عطا فرمایئے بیشک آپ دعاء کو سننے والے ہیں۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ ۝﴾

(پارہ: ۱۷ سورۃ الانبیاء)

"اے میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑیئے یوں تو آپ بہترین وارث ہیں۔"

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

﴿واحب (زکریا) من یونسه ویقویه علی امر دینه و دنیاه ویکون قائما مقامه بعد موته فدعا اللّٰه تعالٰی دعاء مخلص عارف﴾ (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۳۴)

"اور حضرت زکریا علیہ السلام نے ایسا وارث چاہا جو ان کے لئے مونس ہو اور انہیں دینی و دنیوی امر میں تقویت دے اور ان کی وفات کے بعد ان کا قائم مقام ہو جائے لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مخلص عارف کی طرح دعاء کی۔"

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ نے امام بنانے کی خوش خبری سنائی اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں) تو حضرت ابراہیم نے درخواست پیش کی قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۝ (عرض کیا کہ اور میری اولاد میں سے بھی) تو ارشاد ہوا:

﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (پارہ:۱سورۃ البقرۃ)

"میرا وعدہ ظالموں کو نہ پہنچے گا۔"

اس آیت کے تحت بیضاوی شریف میں ہے:

﴿اجابة الٰی ملتمسه و تنبیه﴾

"ان کے درخواست کی قبولیت بھی ہے اور (قبولیت کی شرط پر) تنبیہ بھی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب امامت و نبوت ان کی اولاد میں ہی رہے گا بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو، چنانچہ دوسری آیت میں صراحۃً اس کا ذکر ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾

(پارہ:۲۰سورۃ العنکبوت)

"یعنی ہم نے ان کی (ابراہیم کی) اولاد میں نبوت اور کتاب کو طے کردیا۔"

اسی سبب سے نسلاً بعد نسل انہی کی اولاد میں نبوت و ملوکیت چلتی رہی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعامل

یہاں تک شوریٰ اور نفاذ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کا بیان ہوا، اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعامل بیان کیا جاتا ہے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت اسامہؓ بن زید کی امارت میں ایک لشکر روم کی طرف روانہ فرمایا تھا۔ ابھی حضرت اسامہؓ مقام جرف میں جو مدینہ منورہ سے ایک فرسخ تقریباً چار کلو میٹر ہے پہنچے تھے کہ حضرت عمرؓ نے ان کے پاس یہ خبر پہنچائی کہ رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کی حالت غیر ہے ابھی تم جلدی نہ کرو۔ حضرت اسامہؓ یہ خبر پاکر وہیں ٹھہرے رہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔ (سیرۃ الصدیق صفحہ ۲۸۴)

جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی اور آپ خلیفہ مقرر ہوگئے تو سب سے پہلا جو کام آپ نے کیا وہ جیش اسامہؓ کی روانگی تھا، چنانچہ آپ نے حکم دے دیا کہ لشکر اسامہؓ تیار ہوکر روانہ ہوجائے، اس وقت بہت سے عرب مرتد ہوگئے تھے نفاق کی تاریکی الگ چھائی ہوئی تھی، یہود و نصاریٰ کی سرکشی کی خبریں متواتر مدینہ میں پہنچ رہی تھیں۔ ان حالات کے تحت حضرات صحابہؓ پر لشکر اسامہؓ کو روانہ کرنا شاق ہوا چنانچہ روایت میں ہے:

﴿فشق ذلک علی کبار المهاجرین الاولین﴾

(حیاۃ الصحابہ جلدا صفحہ۴)

یہ (جیش اسامہ کی روانگی) مہاجرین اولیں پر بہت گراں ہوئی۔ اس لئے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ جو آدمی لشکر اسامہؓ میں جارہے ہیں وہ مسلمانوں کے چیدہ اور منتخب افراد ہیں۔ عرب کی حالت آپ کے سامنے ہے ایسی حالت میں مسلمانوں کی جمعیت کو متفرق کرنا مناسب نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

﴿لو خطفتنی الکلاب و الذئاب لانفذته کما امربه رسول الله صلی الله علیه وسلم﴾

”کہ اگر کتے اور بھیڑیئے مجھ کو اچک لے جائیں تب بھی میں اس کو جاری کروں گا جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماگئے ہیں۔“

اسی واقعہ میں ہے کہ انصار نے حضرت عمرؓ کی زبانی حضرت ابوبکرؓ تک یہ بات پہنچائی کہ اگر روانگی لشکر ضروری ہے تو بجائے حضرت اسامہؓ کے کسی زیادہ تجربہ کار

اور سن رسیدہ شخص کو ہمارا سردار مقرر کیجئے۔ جب حضرت عمرؓ نے انصار کا پیغام سنایا تو حضرت ابوبکرؓ غصہ میں بیتاب ہوکر کھڑے ہوگئے اور تیزی کے ساتھ فرمایا

﴿ثکلتک امک یاابن الخطاب استعمله رسول الله صلی اللّٰہ علیه وسلم تآمرنی ان اعزله﴾

(سیرۃ الصدیق صفحہ ۱۸۴)

"اے خطاب کے بیٹے تجھ کو تیری ماں گم کرے ان کو رسول اللہ نے مقرر فرمایا اور تو حکم کرتا ہے کہ میں ان کو معزول کردوں۔"

اس واقعہ میں متعدد مشوروں کے باوجود امیر نے تنہا اپنے عزم پر عمل کیا، کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس عزم و توکل و اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کا ایسا ظہور ہوا کہ جس قبیلہ کی طرف سے یہ لشکر گذرتا تھا ان پر رعب پڑجاتا تھا اور وہ اسلام کی طرف یہ کہتا ہوا لوٹ آتا تھا کہ اگر ان کے پاس قوت نہ ہوتی تو اتنی بڑی جمعیت ان کے پاس سے نہ نکلتی۔

دوسرا واقعہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کے بعد مدینہ کے قرب وجوار کے قبائل نے مرتد ہوکر بالاتفاق مدینہ کا رخ کیا اور مدینہ شریف کو گھیر کر اپنے قاصد کو حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بھیجا کہ نماز تو ہم سے پڑھوا لیجئے مگر زکوٰۃ معاف کردیجئے۔ ان کا پیغام سن کر آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا سب نے یہ صلاح دی کہ نرمی مناسب وقت ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:

﴿یا خلیفة رسول اللّٰہ تالف الناس وارفق بهم﴾

"اے خلیفہ رسول اللہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور الفت کا برتاؤ کیجئے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

﴿أجبار فی الجاهلیة و خوارفی الاسلام قد انقطع الوحی وتم الدین أینقص و اناحیٌّ واللّٰه لا جاهدنهم ولو منعونی عقالاً﴾ (سیرۃ الصدیق صفحہ۲۹۱)

"(اے عمر یہ کیا) تم جاہلیت میں تو بہادر تھے اور اسلام میں آکر کمزور ہوگئے وحی کا سلسلہ منقطع ہوچکا اور دین کمال کو پہنچ گیا کیا میری زندگی ہی میں دین ناقص کردیا جائے گا (ہرگز نہیں) واللہ فرض زکوٰۃ سے رسی کا ٹکڑا بھی دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔"

دیکھئے اس واقع میں حضرت ابوبکرؓ نے تمام صحابہؓ سے مشورہ تو کیا مگر ان کی رائے کے خلاف اپنی رائے پر عزم کر کے قتال مرتدین کا حکم نافذ فرمادیا اور اگرچہ یہ حکم تمام صحابہ کی رائے کے خلاف تھا مگر سب نے بلاچوں وچرا تسلیم کرلیا، کسی نے بھی ان کے خلاف آواز نہ اٹھائی کیونکہ وہ مخلص تھے حب مال، حب جاہ سے پاک تھے، حق شناسی اور فرض شناسی کا جذبہ ان کے اندر بیدار تھا، امیر کی اطاعت اس کا ادب و احترام اور اس کی عظمت کا استحضار ان کی طبیعت بن چکی تھی، آپس میں تحاسد و تباغض نہ تھا، اپنی بات کی پچ نہ تھی۔

نمونہ عمل: صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ جذبہ اتباع و انقیاد ہر زمانہ میں ان لوگوں کے لئے لائحہ عمل ہے جن سے کوئی امیر یا کوئی فرد بشر مشورہ لے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اہل مشورہ کی اکثریت کا کسی رائے میں متفق ہونا ان کی رائے کے صائب ہونے کی دلیل نہیں بلکہ امیر کو خود اپنی فراست و بصیرت کو کام میں لانا چاہئے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے فیصلہ نافذ کردینا چاہئے۔

تیسرا واقعہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی حیات میں خلیفہ مقرر فرمایا تو آپ کی جرأت و بیباکی کی وجہ سے صحابہ کو ان کی خلافت سے اختلاف ہوا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حضرت علی و طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما تشریف لائے اور دونوں نے کہا:

﴿من استخلفت قال عمر قالا فماذا قائل لربک قال تفرقانی لانا اعلم باللّٰہ و بعمر منکما اقول استخلفت علیهم خیر اهلک﴾ (حیاۃ الصحابہ جلد ۲ صفحہ ۲۲)

یعنی حضرت علی اور حضرت طلحہ نے کہا کہ آپ نے کس کو خلیفہ بنایا ہے، فرمایا عمر کو، دونوں صاحبوں نے کہا آپ اپنے رب کو کیا جواب دیں گے، آپ نے فرمایا کیا تم مجھ کو اللہ سے ڈراتے ہو یقیناً میں اللہ کو اور عمر کو تم دونوں سے زیادہ جانتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ سے عرض کردوں گا کہ میں لوگوں پر تیرے بہترین اہل کو خلیفہ بنا آیا ہوں۔

اس واقعہ سے بھی امیر کے عزم و نفاذ کا معتبر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی کے مشورہ کو نہ مانا بلکہ اپنے عزم پر عمل فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعامل

یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کا تعامل مذکور ہوا اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعامل بیان کیا جاتا ہے:

﴿عن سعد بن ابی وقاصؓ قال ما رأیت احداً احضر فهماً ولا الب لبا ولا اکثر علماً ولا اوسع حلماً من ابن عباس ولقد رأیت عمر بن الخطابؓ یدعوه للمعضلات ثم یقول قدجاء تک معضلة ثم لا یجاوز

﴿قوله و کان حوله اهل البدر من المهاجرین و الانصار﴾
(حیاۃ الصحابہ جلد ۲ صفحہ ۴۱)

"حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے زیادہ حاضر دماغ، زیادہ عقلمند، زیادہ علم والا زیادہ حلیم الطبع کسی کو نہیں دیکھا اور میں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو دیکھا ہے کہ ان سے مشکل کاموں میں مشورہ لیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے لو تمہارے لئے مشکل کام آگیا پھر آپ ان کے قول سے تجاوز نہ فرماتے تھے حالانکہ آپ کے ارد گرد اہل بدر مہاجرین و انصار ہوتے تھے۔"

مذکورہ روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کثرت کے مقابلہ میں کسی منفرد کی بات پر عمل کرنا جبکہ امام کو شرح صدر ہوجائے جائز و درست ہے، حضرت عمرؓ باوجود کبار صحابہؓ کی موجودگی کے ابن عباسؓ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ بعض وقت عورت کے مشورہ کو قبول فرمالیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیہقی میں ہے:

﴿عن ابن سیرین قال ان کان عمر بن الخطاب یستشیر حتی ان کان لیستشیر المرءۃ فربما ابصرفی قولها الشئی یستحسنه فیاخذ به﴾ (حیاۃ الصحابہ جلد ۲ صفحہ ۴۱)

"حضرت ابن سیرینؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عورت سے بھی مشورہ لیتے تھے پھر کبھی اس عورت کے مشورہ میں اچھی بات پاتے تو اس کو اختیار کرلیتے تھے۔"

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اصل دارو مدار عزم امیر پر ہے چاہے عورت کی بات سے ہی اس کو شرح صدر ہوجائے جیسا کہ ماقبل میں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت

ام سلمہؓ کے مشورہ نحر و حلق کے بارے میں بھی یہ بات آچکی ہے۔

اہل شوریٰ کا تعیّن ضروری نہیں

اس تمام تر تفصیل سے یہ بات بھی منقح ہوگئی کہ اہل شوریٰ کا تعیّن کوئی ضروی امر نہیں ہے، کیف ما اتفق اہل تجربہ، اہل معاملہ، اہل الرائے سے مشورہ لیا جاسکتا ہے خواہ وہ فاضل ہو یا مفضول، کبیر ہو یا صغیر، مرد ہو یا عورت، اور زمانہ حاضرہ میں انسب بھی یہی ہے کہ مشیروں کا تعیّن مستقلاً نہ کیا جائے کیونکہ اراکین شوریٰ کا تعیّن ایک امر زائد ہے، نیز مستقل ممبر بنانے میں ایک بڑا مفسدہ اس پر فتن زمانہ میں یہ ہے کہ کچھ مدت گذرنے کے بعد ارکان شوریٰ خود کو اصل اور امیر و مہتمم کو تابع سمجھنے لگتے ہیں اور یہ قلب موضوع ہے شرعاً بھی اور عقلاً بھی، شرعاً تو ماقبل میں اس کو مفصلاً بیان کیا گیا۔

مروّجہ جمہوریت کی عقلی خامیاں

اور عقلاً اس میں چند خرابیاں ہیں:

❶ اکثر و بیشتر ارکان شوریٰ اور امیر و مہتمم میں اختلاف رائے پیش آتا رہتا ہے جو ایک فطری امر ہے لیکن اختلاف کی صورت میں اکثریت کی رائے پر فیصلہ کردیا جاتا ہے جو انتظام کی رو سے بھی نامناسب ہوتا ہے بلکہ دوسری اقلیت والی رائے عین انتظام کے مناسب ہوتی ہے جس کے سبب مملکت و ادارہ میں ضعف و تنزل پیدا ہوجاتا ہے۔

❷ مشیروں کا کار متعلقہ میں اہل تجربہ ہونا ضروری ہے اس کی ضرورت کی اثبات میں دو حدیثیں ذکر کی گئیں۔ لا حکیم الاذو تجربة (حکیم تو بس تجربہ کار ہی ہوتا ہے) اور اور انتم اعلم باموردنیا کم (تم اپنے دنیوی امور کو خوب جانتے ہو) ان دو حدیثوں سے واضح ہے کہ مشیر اہل تجربہ کار متعلقہ مشورہ میں رائے و تجربہ

رکھنے والا ہونا چاہئے۔ لیکن مدارس دینیہ میں اکثر جگہ اراکین شوریٰ اہل ثروت و وجاہت اپنے اثرو رسوخ سے یا ادارہ کے مالی تعاون کی وجہ سے ممبر منتخب کرلئے جاتے ہیں، ان کو چونکہ مدرسہ کے عملہ اور طلبہ سے سابقہ نہیں پڑتا اس لئے تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا مشورہ انتظامی حالات اور مدرسہ کے مستقبل کے مفاد کے خلاف ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے جب حضرت گنگوہیؒ مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے تو ایک اہل ثروت رئیس نے مجلس شوریٰ میں داخل ہونا چاہا جیسا کہ یہ واقعہ تفصیلاً اوپر آچکا ہے، حضرت نے بالکل انکار فرمادیا، قصبہ میں بہت شورش پھیلی، قریب تھا کہ مدرسہ بند ہوجائے تو بعض خدام نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت اس وقت شورش کافی ہورہی ہے، مدرسہ کے بند ہونے کا اندیشہ ہے، اگر دفع شر کے لئے ان کو شوریٰ میں لے لیا جائے تو کیا حرج ہے، حضرت نے فرمایا اگر ان شورشوں کی وجہ سے مدرسہ بند ہوگیا تو اس کا وبال اہل شورش پر پڑے گا، مہتمم یا سرپرست سے باز پرس نہ ہوگی۔ اور اگر باوجود اہل نہ ہونے کے ان کو داخل کرلیا جائے گا تو ہم سے نا اہل کو داخل کرنے کی پوچھ ہوگی۔ پھر جو بعض اہل علم کو بھی شوریٰ کا ممبر بنالیا جاتا ہے تو اکثر انہی کو لیا جاتا ہے جن پر جدید طرز و تعلیم اور سیاست حاضرہ کا اثر ہوتا ہے اس لئے مدرسہ کو خاطر خواہ دینی رجحان پیدا ہونے کے لئے مشورہ نہیں ملتا بلکہ مدرسہ میں جدت اور موجودہ سیاست آتی رہتی ہے جو انجام کار دینداری سے بہت دور کردیتی ہے۔

❸ بعض وقت مدرسہ کے بعض افراد عملہ اور طلبہ اپنے معاملہ کو ممبران شوریٰ کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عدم تجربہ اور ان سے سابقہ نہ پڑنے کے سبب اراکین شوریٰ اس کو صحیح سمجھ لیتے ہیں اور کبھی کبھی یکطرفہ فیصلہ ہوجاتا ہے جو مدرسہ کے لئے سخت مضر ہوتا ہے۔

اہل شوریٰ کے صفات

اب تک کی تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ کس قسم کے لوگوں سے مشورہ لینا چاہئے مثلاً حضرت ابن عباسؓ جن کی رائے حضرت عمرؓ بدریین کے مقابلہ میں بھی قبول فرمالیتے تھے، ان کی صفات حضرت سعد بن وقاصؓ نے یہ بتلائی ہیں کہ وہ حاضر دماغ، عقلمند، علم والے اور صاحب حلم تھے۔ سو معلوم ہوا کہ مشیر بیدار مغز، عقلمند، صاحب علم و حلم ہونا چاہئے۔

نیز حدیث شریف میں ہے استرشدوا العاقل ولا تعصوه فتندموا مدبر، دوراندیش سے مشورہ لو اور بعد اثبات حق اس کی مخالفت نہ کرو، ورنہ شرمندہ ہوگے۔ صاحب روح المعانی اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

﴿وینبغی ان یکون المستشار عاقلا کما ینبغی ان یکون عابدا﴾ (روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۴۶)

"اور مناسب ہے کہ مشیر مدبر دور بیں و دور اندیش ہو جیسا کہ مناسب ہے کہ متدین ہو۔"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مشیر کے لئے عاقل ہونے کے ساتھ عابد (متدین) ہونا بھی ضروری ہے۔ حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عباسؓ کو جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشیر تھے یہ وصیت فرمائی تھی، بیہقی میں ہے:

﴿ان العباس قال لابنه عبدالله انی اریٰ هٰذا الرجل قداکرمک یعنی عمر بن الخطاب وادنی مجلسک و الحقک و بقوم لست منهم فاحفظ عنی ثلاثة لا یجربن علیک کذباً ولا تفش علیه سرًّا ولا تغتابن عندهٗ احداً﴾

(حیاۃ الصحابہ جلد ۲ صفحہ ۶۶)

''حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ میں اس شخص یعنی عمرؓ بن الخطاب کو دیکھتا ہوں کہ انہوں نے تیرا اکرام کیا ہے اور تمہیں اپنا قرب دیا ہے اور تمہیں ایسے لوگوں کے ساتھ شامل کیا ہے کہ تم ان میں سے نہیں ہو، لہٰذا میری تین نصیحتیں یاد رکھو، ① کبھی وہ تم پر جھوٹ کا تجربہ نہ کریں، ② ان کا بھید کسی پر ظاہر نہ کرنا، ③ ان کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرنا۔''

معلوم ہوا کہ مشیر کو صادق القول، راز دار، عیب گوئی سے پاک صاف ہونا چاہئے، نیز حدیث شریف میں ہے المستشار مؤتمن (مشیر امانت دار ہوتا ہے) المجالس بالامانة (مجالس امانت کے ساتھ ہوتی ہیں) پس مشیر کے لئے راز دار ہونا بھی ضروری ہے۔

اہل شوریٰ کی صفات کا خلاصہ

حاصل یہ کہ مشیر ایسا ہونا چاہئے، بیدار مغز، مدبر، تجربہ کار، دور بیں، دور اندیش، واقف کار واقعہ، صاحب حلم، صاحب دیانت و تقویٰ، صادق القول، عیب گوئی نہ کرنے والا، راز دار۔

امیر و ذمہ دار کے صفات

اس کے بعد یہ امر بھی بیان کردینا ضروری ہے کہ شریعت میں جس امیر کی اطاعت اس قدر ضروری اور لابدی قرار دی گئی ہے اس کے صفات کیا ہونا چاہئیں تاکہ ہر کس و ناکس اس منصب کی ہوس نہ کرے اور خدانخواستہ ادارہ یا مدرسہ میں اپنی ملک و جاگیر کی طرح بے محابا تصرف نہ کرسکے بلکہ مدرسہ کو خدائی امانت سمجھ کر

بہت سوچ، سمجھ کر نہایت حلم و تدبیر اور محتاج مشورہ امور میں اہل تجربہ و دانش سے مشورہ لے کر کام کرے اور اگر بالفرض مہتمم صاحب علم نہ ہو بلکہ ملکہ انتظام رکھنے کی وجہ سے یا کسی دوسری مصلحت سے مہتمم بنادیا گیا ہے جیسا کہ بعض چھوٹے مدرسوں میں ایسا واقع ہوتا رہتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ اہل علم و اہل فتویٰ کے بغیر کوئی کام نہ کرے ورنہ اللہ کے مال کو اس کی مرضی کے خلاف صرف کرے گا اور دنیا و دین دونوں میں مطعون ہوکر خسر الدنیا و الاخرة کا مصداق ہوگا۔ چنانچہ وہ صفات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

❶ ﴿عن ابی هریرة ؓ قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین قال الحافظ معنیٰ قوله ذبح بغیر سکین ان الذبح بالسکین یحصل به اراحة الذبیحة بتعجیل ازهاق روحها فاذا ذبح بغیر سکین کان فیه تعذیب لها﴾

(الترھیب والترغیب جلد ۲ صفحہ ۷۷)

"ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو قضا سپرد کی گئی، وہ بلا چھری کے ذبح کردیا گیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ بلا چھری کے ذبح کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ چھری سے ذبح کرنے سے جانور کو جلد روح نکلنے کی وجہ سے راحت ہوتی ہے تو جب بغیر چھری ذبح کیا گیا تو اس میں تکلیف زیادہ ہوگی۔"

اس کی تشریح یہ ہے کہ فیصلہ کے وقت فریقین میں سے صاحب حق کے حق کی تحقیق کے لئے بڑی چھان بین کرنا پڑتی ہے جس کی وجہ سے قاضی پر ذہنی اور جسمانی بڑی مشقت پڑتی ہے اور بڑی عرق ریزی سے کام لینا پڑتا ہے اور ایسا وہی شخص

کر سکتا ہے جس میں تین باتیں ہوں۔

اول: دیانت جس کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔

دوم: جرأت و شجاعت۔

سوم: سیاست بمعنی حکمت جس کو تدبیر حسن اور حکمت عملی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

دیانت کا یہ اثر ہوگا کہ طرفین میں سے کسی کا طرفدار نہ ہوگا، ظلم سے محفوظ رہے گا، عدل سے کام لے گا، جرأت کا یہ اثر ہوگا کہ تحقیق حق میں کسی کا دباؤ قبول نہ کرے گا، نیز اجراء احکام میں کسی کی مخالفت کی پروا نہ کرے گا اور کلمۃ الحق کو غالب رکھے گا۔

سیاست کا یہ اثر ہوگا کہ معاملہ کو مدبرانہ، حکیمانہ طور سے نہ کہ محض حاکمانہ طور سے خوبصورتی سے حل کرے گا، کام کو تدبیر احسن سے بجالائے گا نہ تعجیل ہوگی نہ اشتعال و بھڑک ہوگی بلکہ باوقار و بامتانت حسب موقع بحفاظت قیام امن تعمق سے حل کرے گا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

❷ ﴿عن عوف بن مالکؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال ان شئتم انبأتکم عن الامارة ماھی فنادیت باعلٰی صوت وماھی یا رسول اللّٰہ قال اولھا ملامة و ثانیھا ندامة و ثالثھا عذاب یوم القیٰمة الاّ من عدلٰ و کیف یعدل مع قریبهٖ﴾

(الترھیب والترغیب جلد۲ صفحہ۷۷)

”حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں تم کو حکومت کے بارے میں خبر دوں کہ وہ کیا ہے تو میں نے باآواز بلند عرض کیا،

وہ کیا ہے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا اول درجہ میں تو ملامت ہے اور دوسرے درجہ میں ندامت ہے اور تیسرے درجہ میں قیامت کے دن کا عذاب ہے ہاں مگر جو عدل کرے اور رشتہ دار کے ساتھ کیسے عدل کرے گا۔"

اس حدیث سے بھی ذمہ دار کے لئے دیانت کا ہونا بصراحت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عدل دیانت کی فرع ہے، نیز جرأت کی ضرورت بھی مترشح ہوتی ہے کہ رشتہ دار کے ساتھ عدل کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے کیونکہ رشتہ دار سے ہر وقت مخالفت کا اندیشہ رہتا ہے لہٰذا ایسے موقعہ پر عدل کے لئے جہاں دین میں پختگی ضروری ہے وہیں جرأت کی بھی ضرورت ہے۔ نیز لوگوں کی ملامت اور اپنی شرمندگی دفع کرنے کے لئے بھی بڑی جرأت اور ہمت کی ضرورت ہے۔

نیز اگر غور کیا جائے تو سیاست بمعنی تدبیر حسن کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ رشتہ دار جن سے ہر وقت کا معاملہ رہتا ہے ان سے بگاڑ اچھا نہیں تو معاملہ اور برتاؤ میں تدبیر حسن اور حکمت عملی اختیار کرے گا کہ عدل بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور رشتہ داروں سے خواہ مخواہ بگاڑ بھی پیدا نہ ہو، تو حدیث پاک کا آخری جملہ "کیف یعدل مع قریبہٖ" سیاست اور حکمت عملی کی طرف اشارہ کرتا ہے، اسی وجہ سے حکیم و مدبر کے فیصلہ میں بعض وقت تاخیر ہو جاتی ہے کہ وہ طریق احسن کی تلاش میں رہتا ہے۔

الغرض امیر و ذمہ دار کے لئے یہ تینوں باتیں ضروری ہیں۔ حضرت والا، (مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ) نے جابجا اپنے ملفوظات میں ارشاد فرمایا ہے کہ امیر کے لئے یہی تین باتیں ضروری ہیں۔ دیانت، جرأت، سیاست، بمعنی حکمت عملی۔ اور یہ تینوں باتیں جس میں ہوں گی وہ یقیناً مؤید من اللہ ہو گا۔ جیسا کہ ذیل کی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔

﴿قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثلاثۃ لا ترد دعوتھم الصائم حتّٰی یفطر والامام العادل و دعوۃ المظلوم﴾ (الترھیب جلد ا صفحہ ۸۴)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کی دعاء رد نہیں کی جاتی، روزہ دار یہاں تک کہ افطار کرے اور امیر عادل اور مظلوم کی فریاد۔“

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عادل مستجاب الدعوات ہوتا ہے تو معاملہ میں دعاء تحقیق حق کرے گا اور اس کو حق دکھلایا جائے گا لہٰذا وہ مؤید من اللہ ہوا۔ نیز ایک حدیث میں ہے:

﴿عن عیاض بن حمار قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اھل الجنۃ ثلاثۃ ذوسلطان مقسط موفق الخ﴾

”حضرت عیاض بن حمار سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ تین شخص جنتی ہیں جن میں ایک امیر صاحب سلطنت جو عادل منجانب اللہ توفیق دیا ہوا ہے۔“

حضرت والا (مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ امیر کے لئے انہی تینوں صفات جرأت، دیانت، سیاست کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ لیکن واقعات و حالات میں غور کرنے سے امیر و ذمہ دار کے لئے ایک صفت اور ضروری ہے اور وہ ہے تیقظ و بیداری، معاملات ماتحت کی نگرانی اور دیکھ بھال بحد اعتدال رکھنا تاکہ غفلت و تغافل زوال سلطنت کا سبب نہ ہوجائے۔ چنانچہ حضرت والا (تھانوی نوراللہ مرقدہ) فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً نو سو برس رہی لیکن آخر میں زائل

ہوگئی جس کا سبب غفلت تھی اس لئے حفاظت سلطنت و حکومت کے لئے تیقظ اور بیدار مغز ہونا ضروری ہے اس پر سلف کے یہ دو واقعے شاہد عدل ہیں۔

اول: یہ کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کو گشت فرمارہے تھے کہ ایک مکان سے گانے بجانے کی آواز سنائی دی، آپ مکان کی پشت سے اندر داخل ہوئے کیونکہ دروازہ کھلوانے میں ان کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا ان لوگوں نے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو سہم گئے کہ یہ حضرت عمرؓ ہیں صاحب درہ، ان کا درہ مشہور ہے، خدا خیر کرے، لیکن ایک شخص نے جرأت کرکے کہا کہ امیرالمومنین ہم نے تو ایک ہی خطا کی اور آپ سے چند خطائیں سرزد ہوئیں۔ ایک یہ کہ آپ نے تجسّس فرمایا اور قرآن پاک میں ہے وَلَا تَجَسَّسُوْا (تجسس مت کرو) دوسری یہ کہ آپ مکان کی پشت سے داخل ہوئے اور قرآن پاک میں ارشاد ہے وأتوا البیوت من ابوابھا (گھروں میں دروازہ سے داخل ہو) تیسری یہ کہ آپ بلا اجازت غیر کے گھر میں داخل ہوئے حالانکہ قرآن پاک میں ہے لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا (غیروں کے گھروں میں بلا اجازت اور سلام کئے ہوئے مت داخل ہو) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجارات مع الخصم کا حکیمانہ طریق تربیت اختیار فرماتے ہوئے فرمایا بہت اچھا میں بھی توبہ کرتا ہوں آپ لوگ بھی تائب ہوجایئے۔ چنانچہ سب نے توبہ کرلی۔

اس واقعہ سے آپ کے تیقظ و نگرانی کے ساتھ حکمت و دانائی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس وقت حاکمانہ اور مجادلانہ طریق نہیں اختیار فرمایا کہ اس میں بات بڑھتی بلکہ حکیمانہ طریق اختیار فرماکر بات ختم کردی اور مقصد "اصلاح و توبہ" تھی حاصل ہوگیا اور یہ عین مظہریت صفت ذات باری تعالیٰ ہے کہ حق تعالیٰ حاکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہیں، ذمہ دار میں یہ دونوں صفتیں ہونا ضروری ہیں۔ یہ تو حاضرانہ تیقظ و نگرانی کا واقعہ ہے۔

اور غائبانہ تیقظ پر یہ واقعہ شاہد ہے کہ جب آپ ملک شام کے سفر سے واپس تشریف لائے تو اس خیال سے کہ میرے پیچھے مملکت کا کیا حال رہا، مدینہ طیبہ سے باہر کہ یہی دارالخلافہ تھا ایک طرف نکل کھڑے ہوئے، چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے وہاں ایک جھونپڑی پر نظر پڑی جس میں ایک غریب بڑھیا رہتی تھی، آپ سلام فرماکر بڑھیا کی خیریت معلوم فرمانے لگے۔ باتوں باتوں میں پوچھا بڑی بی تم عمر کو کیسا سمجھتی ہو، بڑھیا نے جواب دیا، عمر کو پوچھتے ہو، اس سے تو اللہ بچائے، حضرت عمرؓ نے پوچھا کیوں اس میں کیا خرابی ہے؟ کہنے لگی اس نے میری کوئی خبر ہی نہیں لی، حضرت عمرؓ نے فرمایا بڑی بی عمر تنہا آدمی کس کس کی خبر لے تم یہاں اتنی دور رہتی ہو، وہ مدینہ میں ہے، تم نے اس کو اطلاع کر کے اس کی مدد لی ہوتی، بڑھیا نے ایک آہ کھینچی اور کہا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ رعیت اپنے حال کی امیر کو اطلاع دے۔ امیر کو خود رعیت کے حال پر مطلع ہونا چاہئے اور مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں رہنے والی رعایا کے احوال سے واقف ہونا چاہئے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنکھوں میں آنسو آگئے اور اپنے نفس کو خطاب کر کے فرمایا اے عمر تیرے علم سے تو بڑھیا کا علم زیادہ ہے، اس نے کیا عجیب اچھی بات کہی۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا بڑی بی عمر کے قصور کو معاف کردو، بڑھیا نے کہا جاجا کیوں مذاق کرتا ہے، حضرت عمر نے فرمایا بڑی بی کچھ لے کر معاف کردو، یہ لو پچیس سکے اور عمر کو معاف کردو، بڑی بی نے وہ روپئے لے لئے اور کہا اچھا جاؤ میں نے عمر کو معاف کردیا۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت عمرؓ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور دونوں نے بیک زبان فرمایا السلام علیکم یا امیر المؤمنین اب تو بڑھیا سن کر گھبراگئی کہ یہی عمر ہیں، بڑھیا کا یہ حال دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا بڑی بی کچھ خیال نہ کرو تمہارا ہم پر بہت احسان ہے کہ معاف کر کے جہنّم کی آگ سے نجات دلادی۔ یہ کہہ کر واپس

تشریف لے آئے۔

امیر و ذمہ دار کی صفات کا خلاصہ

الحاصل تفصیل مذکور سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ امیر و ذمہ دار کے لئے متدین، جری، مدبر ہونے کے ساتھ متیقظ، حالات حکومت سے واقف ہونا بھی ضروری اور لابدی ہے۔

اگر کوئی کہے کہ امیر کی جو صفات بیان کی گئی ہیں کیا اس زمانہ میں مہتمم میں وہ صفات مکمل پائی جاتی ہیں، ظاہر یہ ہے کہ ان صفات کا اکثر مہتممین میں ملنا دشوار ہے، جواب یہ ہے کہ پھر اہل شوریٰ میں بھی یہ صفات نہیں ہیں، جب ان میں بھی نہیں ہیں تو مہتمم کی رائے کو ہی ترجیح ہوگی کیونکہ وہ درجہ امارت میں ہے اور امیر و شوریٰ کے متعلق سابق میں تفصیل آچکی کہ امیر کی اتباع لازم ہے۔

کن امور میں مشورہ لیا جائے

آخر یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ مشورہ کرنا ہر کام میں ضروری ہے یا محل مشورہ خاص امور ہیں؟

اس میں یہ تفصیل ہے کہ امور دو قسم کے ہیں منصوصہ، غیر منصوصہ، امور منصوصہ جن کا حکم شریعت میں صراحۃً موجود ہے۔ نماز، روزہ وغیرہ ان میں مشورہ کی ضرورت نہیں کیونکہ شریعت کا حکم ہوتے ہوئے کسی انسان کی طرف رجوع کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اسی کو روح المعانی میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے:

﴿المراد بالاحکام ممالم یکن فیہ نص شرعی والا فالشوریٰ لا معنیٰ لھا وکیف یلیق بالمسلم العدول عن حکم اللّٰہ عزوجل الی آراء الرجال واللّٰہ سبحانہ ھو

الحکیم الخبیر ﴾ (روح المعانی پارہ: ۲۵ صفحہ ۴۶)

"مراد ان احکام سے جن میں مشورہ کیا جاتا ہے وہ ہیں جن میں نص شرعی نہ ہو ورنہ تو مشورہ کے کوئی معنیٰ نہیں کیونکہ مسلمان کے لئے یہ کس طرح لائق ہے کہ اللہ عزّوجلّ کے حکم سے لوگوں کی رائے کی طرف عدول کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہیں۔"

عبارت مذکورہ سے بصراحت معلوم ہوگیا کہ امور منصوصہ میں تو مشورہ جائز ہی نہیں ہے۔

اور امور غیر منصوصہ دو قسم کے ہیں ایک امور مہتمہ بالشان جن میں خیر و شر، نفع و ضرر دونوں احتمال ہیں دوسرے طبعیات اور معمولی امور جیسے کھانا، پینا وغیرہ۔ پس محل مشورہ وہ امور مہتمہ بالشان ہیں جن میں خیرو شر، نفع و ضرر دونوں احتمال موجود ہوں، چنانچہ روح المعانی کی ذیل کی عبارت سے اس کا پتہ چلتا ہے:

﴿ وقد كانت الشورى بين النبى صلى الله عليه وسلم و اصحابه فيما يتعلق بالحرب و كذا بين الصحابة رضى الله تعالى عنه بعد ه عليه الصلوة والسلام و كانت بينهم ايضاً فى الاحكام كقتال اهل الردة و ميراث الجدو عدد حد الخمرو غير ذٰلک ﴾ (روح المعانی)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے درمیان مشورہ ایسے امور میں ہوتا تھا جو جنگ کے مصالح سے متعلّق تھے اور اسی طرح صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان بھی مصالح جنگ میں مشورہ ہوتا تھا نیز بعض احکام (غیر منصوصہ) میں بھی صحابہ کے درمیان مشورہ ہوتا تھا جیسے اہل ردت سے قتال، دادا کی

میراث، حد خمر کا عدد وغیرہ۔"

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ کہ احکام منصوصہ میں مشورہ جائز ہی نہیں وہ بہر حال قابل عمل ہیں الّا بحالت عذر شرعی کہ شریعت نے خود ان اعذار کی تشریح کردی ہے جو کتب فقہ میں محفوظ ہیں، دوسرے غیر منصوصہ طبعی اور معمولی امور جن میں خیرو شر دونوں پہلو نہیں ہیں، ان میں بھی مشورہ کی حاجت نہیں، تیسرے امور مہتمہ محتملہ للخیرو الشرو النفع و الضرر یہ البتہ محل مشورہ ہیں ایسے ہی امور کے لئے حکومت و اداروں میں مشورہ کی حاجت ہوتی ہے، انہی امور محتملہ للنفع و الضرر میں جمیع پہلو واضح ہونے کے لئے مشورہ کیا جاتا ہے وشاورھم فی الامر کا محمل یہی ہے رہا نفاذ کے لئے کسی ایک شق کو اختیار کرنا تو یہ امیرو مہتمم و ذمہ دار کی رائے پر موقوف ہے جیسا کہ ارشاد ہے فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ جس کا مفصلاً بیان ہوچکا۔

حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی قدس سرہ تھانوی کے ارشادات

اب حضرت والا (مولانا تھانویؒ) کے ارشادات نقل کرکے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ ارشاد فرمایا کہ:

❶ اجتماعی کاموں میں عقل کی بات یہ ہے کہ ایک شخص معتمد ہو اور سب اس کے ماتحت ہوں۔ (فیوض الرحمٰن صفحہ ۲۶)

❷ نظام عالم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ بعض تابع ہوں اور بعض متبوع ہوں، بدوں اس کے قائم نہیں رہ سکتا "اور متبوع ایک ہی ہو" حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی

ایک کا تابع کیا جائے۔ تو شریعت اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کردیا بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانہ میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ (یعنی ہارون علیہ السلام) ان کی (یعنی موسیٰ علیہ السلام کی) مخالفت نہ کرسکتے تھے۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں تابع تھے چنانچہ ایک واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلّف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کے مقتضا پر عمل کیا، اور وہ برتاؤ کیا جو حاکم محکوم کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی۔

۳ یہ بات اصول شرع و اسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے۔ اور اپنی اعانت کیلئے وہ دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے۔ اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معاملہ کے سب پہلو اسے مستحضر ہوجاتے ہیں، جب سب پہلو نظر میں آجاویں تو اس کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرلے اسی کا حکم دیدے یہی طریق مشروع و معقول ہے۔ (دعوت تبلیغ مطبوعہ پاکستان)

پس اپنی اپنی رائے یا کثرت رائے کا اتباع نہ کرو بلکہ حکم واحد کا اتباع کرو۔

(اصلاح صفحہ ۱۸۰، غایۃ النجاح)

الحمد للہ تعالیٰ حق تعالیٰ کی توفیق اور حضرت والا کی برکت سے مسئلہ اہتمام و شوریٰ کے متعلق رسالہ پورا ہوگیا، حق تعالیٰ اس کو مقبول اور نافع بنائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

مشورہ کے وقت کی دعائیں

کسی بھی اہم کام کے متعلق مشورہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾

"اور ان سے مشوہ لے کام میں۔" (آل عمران: ۱۵۹)

اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ ہر کام کو مشورے سے کیا کرے اور جس سے مشورہ طلب کیا جائے اس پر لازم ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ مشورہ دے، مشورہ کا اہتمام ہر کام میں کریں چاہے کوئی اجتماعی مسئلہ ہو یا انفرادی مثلاً مکان خریدنا ہے، یا دکان خریدنی ہے یا رشتہ ڈالنا ہے یا رشتہ کا جواب دینا ہے، الغرض کوئی بھی کام ہو تو گھر کے تمام افراد مل کر مشورہ کرلیں، اسی طرح کوئی انفرادی یا ذاتی مسئلہ ہو، کوئی پریشانی ہو، کسی بات میں کوئی راہ نہ دکھائی دے تو دیندار تجربہ کار رازدار لوگوں سے مشورہ کرلیں، ایسا کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ ہر پریشانی کا حل بھی سمجھ میں آجائے گا اور غم بھی ہلکا ہوجائے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی پہلی پہلی مرتبہ اترنے پر طبیعت پر جو بوجھ محسوس فرما رہے تھے تو آکر اپنی زوجہ مطہرہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مشورہ کیا جس سے بہت ہی تسلی ہوئی اور غم ہلکا ہوگیا، اسی طرح صلح حدیبیہ کے وقت جب سب مسلمان پریشان تھے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مشورہ کیا اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مبارک رائے اس موقع پر مسلمانوں کو بہت بڑی پریشانی سے بچانے کا ذریعہ بن گئی، لہٰذا ہر معاملہ میں مشورہ ضرور کرلینا چاہئے اس لئے کہ مشورہ کے کئی فوائد ہیں، مثلاً سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ گھروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کی سنت زندہ ہوگی، اور جہاں سنت زندہ ہوتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ اپنی

رحمت کو نازل فرماتے ہیں۔

دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ گھر کے افراد اور متعلقین اور دوست احباب میں آپس میں محبت قائم ہوگی ہر ایک یہ سمجھے گا کہ میرا بھی ایک مقام و اہمیت ہے اس لئے تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے۔ اور سب کے دل آپس میں جڑے ہوئے ہوں گے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کسی فرد واحد کا فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ ایک اجتماعی فیصلہ ہوگا، لہٰذا اگر خدانخواستہ کل کو وہ کام جس کے متعلق مشورہ کیا گیا ہے باعث نقصان ہوا تو کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ ہم سے تو پوچھا ہی نہیں پوچھ لیتے تو ایسا نہ ہوتا، وغیرہ وغیرہ۔

مشورہ کرتے وقت مندرجہ ذیل آداب کا خوب خیال رکھا جائے بلکہ ہر مشورہ سے پہلے ان کو بیان بھی کیا جائے تاکہ یاد دھانی ہو۔

❶ مشورے کا ایک امیر مقرر ہو جو سب سے باری باری مشورہ لے اور آخر میں سب کی رائیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کرے، جب امیر فیصلہ کرلے تو سب کو چاہئے کہ وہ اس پر راضی رہیں۔

❷ ہر شخص اپنی باری سے مشورہ دے جب تک اس سے مشورہ طلب نہ کیا جائے مشورہ نہ دے، اور جب مشورہ طلب کیا جائے تو خوب سوچ سمجھ کر اور انتہائی وقار سے اپنی رائے پیش کرے اور پھر خاموش ہوکر دوسروں کی آراء خوب غور سے سنے اور اگر اس درمیان پھر کچھ بات یاد آجائے یا کسی کی رائے کا کوئی کمزور پہلو سامنے آجائے تو فوراً نہ بولے بلکہ اجازت لے کر آخر میں جب سب اپنی اپنی رائے دے چکیں اپنی بات بیان کردے۔

❸ کسی دوسرے کی رائے کو کاٹا نہ جائے البتہ اپنی رائے کو مؤکد کرنے کے لئے اس کا فائدہ اور اس کی حکمت ضرور بیان کرلے، لیکن کسی کی رائے سامنے آنے کے بعد یہ نہ کہے کہ نہیں یہ صحیح نہیں، یا یہ نہیں ہوسکتا، یہ تو سمجھ

نہیں آرہا، بلکہ یہ کہے کہ یہ اس کی رائے ہے اللہ اس میں خیر ڈالے، میری رائے یہ ہے۔

۴ ہر شخص رائے کو رائے سمجھ کر دے فیصلہ سمجھ کر نہ دے کہ ایسا ہی ہو گا بلکہ اگر کسی کی رائے پر فیصلہ ہوجائے تو وہ اللہ سے اس کام کی اصلاح کے لئے دعائیں کرتا رہے اور استغفار کرتا رہے، اور جس کی رائے پر فیصلہ نہ ہو وہ اسی میں بہتری سمجھے، اور دوسرے کو مناسب نہیں کہ وہ اس شخص کی رائے پر طعن و تشنیع کرے۔

۵ اللہ نہ کرے اگر مشورہ کے بعد کوئی آزمائش آئے تو یہ نہ کہے کہ میں نے تو پہلے کہا تھا..... دیکھو تم نے میری بات نہ مانی اگر میری بات مان لیتے تو یہ نہ ہوتا..... وغیرہ، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ:

"لفظ "اگر" شیطان کا دروازہ کھولتا ہے۔" (مشکوۃ جلد ۲ صفحہ ۴۵۲)

لہٰذا یہ نہ کہے اگر میری رائے پر فیصلہ ہوجاتا تو یہ نہ ہوتا، اگر یوں کرلیتے تو یوں نہ ہوتا بلکہ یوں کہے مَاقَدَرَ اللّٰهُ وَمَاشَآءَ فَعَلَ جو کچھ اللہ نے مقدر کیا تھا وہی ہوا اور بہتر ہوا اس کے ساتھ ساتھ ان مندرجہ ذیل دعاؤں کا اہتمام کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس مشورہ میں خیر و برکت ڈالے اور شیطان کے شر سے بچائے۔

﴿اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنَا مَرَاشِدَ اُمُوْرِنَا وَاَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا﴾

"الٰہی ہمارے مقدر کی بھلائی ہمارے دلوں میں ڈالدے اور ہم کو ہمارے نفس کی بدی سے بچالے۔" (ترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۸۶)

﴿اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِیْ وَاَسْتَهْدِیْكَ لِمَرَاشِدِ اَمْرِیْ۔ وَ اَسْتَجِیْرُكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَ اَتُوْبُ اِلَیْكَ فَتُبْ عَلَیَّ اِنَّكَ اَنْتَ رَبِّیْ﴾

”اے اللہ! میں تجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش کا طالب ہوں اور اپنے معاملہ میں کامیابی کی راہوں کی ہدایت مانگتا ہوں اور اپنے نفس کے شر سے تیری پناہ ڈھونڈتا ہوں اور تیرے سامنے توبہ کرتا ہوں تو میری توبہ قبول فرمالے کیونکہ یقیناً تو ہی میرا پروردگار ہے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۶ صفحہ ۳۴)

﴿ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاهْدِنِی السَّبِیْلَ الْاَقْوَمَ ﴾

”اے اللہ بخش دے اور رحم فرمادے اور سب سے صحیح راستہ نصیب فرما۔“ (مسند احمد حدیث نمبر۲۵۴۶۳ الحزب الاعظم صفحہ ۸۳)

﴿ اَللّٰهُمَّ قِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ وَاعْزِمْ لِیْ عَلٰی اَرْشَدِ اَمْرِیْ ﴾

”اے اللہ مجھ کو میرے نفس کے شر سے بچا اور مجھ کو میری ہدایت کے کاموں کے کرنے کی ہمت بخش دے۔“ (مسند احمد جلد۴ صفحہ ۴۴۴، کنز العمال جلد۱۳ صفحہ ۳۵۶)

﴿ اَللّٰهُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیَنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ بِنَا فَكُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا وَاهْدِنَآ اِلٰی سَوَآءِ السَّبِیْلِ ﴾

”اے اللہ ہمارے دل ہماری پیشانیاں اور ہمارے سب اعضاء تیرے ہی ہاتھ میں ہیں ان میں سے کسی کا تونے ہم کو مالک نہیں بنایا ہے، پھر جب تونے ہم کو ایسا بے بس پیدا فرمایا ہے تو اب تو ہی ہمارا کارساز بن جا اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔“ (حلیہ الاولیاء جلد۱ صفحہ ۹۹، کنز العمال جلد۱ صفحہ ۱۹۴)

اسلامی معلومات میں اضافہ اور دینی جذبہ پیدا کرنے والی کتابیں

۱...... **البشیر والنذیر** (ترجمہ وشرح الترغیب والترہیب، مترجم: مولانا محمد عثمان صاحب) رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث مبارکہ کا عربی متن وترجمہ اور ضروری فوائد کے ساتھ وہ مستند ذخیرہ جس میں نیک اور بھلے اعمال پر دنیاو آخرت کے فائدے اور انعمات اور برے اعمال پر دنیاو آخرت میں آنے والے نقصانات کا ذکر ہے۔ ایک ایسی بہترین کتاب جس کے پڑھنے سے ایک مسلمان کے دل میں نیکیوں کی رغبت اور گناہوں سے نفرت بیٹھتی ہے۔

حصہ اول...... حصہ دوم...... حصہ سوم......

۲...... **شمائل کبری** خالق کائنات نے انسانوں کی ہدایت کیلئے عالم میں نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ قائم فرمایا، ان برگزیدہ ہستیوں کے واسطے سے بندوں تک ہدایت کا پیغام پہنچایا، اور ان کے واسطے سے اپنا فرمان بندوں کو بھیجا جس کی انتہاو تکمیل قرآن مجید پر ہوئی، خداوند قدوس نے اپنے پیغام کو براہ راست بندوں پر نازل نہیں کیابلکہ پیغام وفرمان کے ساتھ اس کو سمجھانے والا، اس پر عمل کر کے دکھانے والا بھی بھیجا، کیونکہ پیغام الٰہی کو سمجھنا اور اس سے ہدایت کا حاصل کرنا بلا نبی ورسول کے ممکن ہی نہیں، چنانچہ قرآن میں ہے **لقد جاء کم من اللہ نور و کتب مبین** تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک نور اور واضح کتاب آئی ہے، اس نور سے مراد آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

۳...... **تعلیم و تعلم اور دعوت کے اسلامی اصول و آداب** حصول دین و اشاعت کے رہنما اصولوں کا ایک جامع ترین مجموعہ جس میں کتاب اللہ، اسوۂ رسول اکرم ﷺ اور اسلاف کے زندہ و جاوید آثار و واقعات کی روشنی میں مؤثر، ترتیب سہل وسادہ زبان، عام فہم تشریحات اور بصیرت افروز دلائل کے ساتھ تعلیم و تعلم اور دعوت کے اصول وآداب نمبروار بیان کئے گئے ہیں ہر طالب علم، استاد اور داعی کے لئے بہترین تحفہ۔

۴...... **مستند مجموعہ وظائف** اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر اور تکالیف اور مصائب پر صبر کے ذریعے انسان بلند درجات حاصل کر سکتا ہے، ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے امت کو سکھایا ہے وہی ساری پریشانیوں کیلئے تریاق بھی ہے اور مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچنے کا ذریعہ بھی ہے، اس کتاب میں پنج سورہ، درود شریف، اسماء حسنی اور قرآن پاک واحایث میں مذکورہ مستند دعائیں ہیں جو دل ودماغ کے سکون واطمینان کا بہترین ذریعہ ہیں۔

زم زم پبلشرز: شاہ زیب سینٹر گوالی لائن نمبر ۳ رتن تلاؤ نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی